غالب کے فارسی خطوط

پروفیسر حنیف نقوی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

غالب کے فارسی خطوط

پروفیسر حنیف نقوی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

GHALIB KE FARSI KHUTOOT
BY
Prof. Haneef Naqvi

ISBN 81-8172-070-9

اہتمام	:	سید رضا حیدر
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۵ء
قیمت	:	۱۵۰ روپے
مطبوعہ	:	اصیلا پرنٹنگ پریس، نئی دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲
www.ghalibinstitute.org

پیش لفظ

پروفیسر حنیف نقوی کے مضامین کا یہ مجموعہ شائع کرتے ہوئے ہمیں خاص طور سے خوشی ہو رہی ہے۔ آپ ایک اہم اور معروف محقق تھے۔ پروفیسر حنیف نقوی کے کئی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، وہ فارسی کے بھی مستند عالم تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے استفادہ کر کے اردو میں بہت سے ایسے مضامین شائع کیے جن کی طرف عام طور سے مصنفین توجہ نہیں دیتے تھے۔ خصوصاً غالب کے تعلق سے تو اس کی خاص ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔ پروفیسر حنیف نقوی کا غالب انسٹی ٹیوٹ سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق تھا۔ اُن کے مشوروں سے ہم نے بہت فائدہ اُٹھایا۔ ان کا اصل مشغلہ تو درس و تدریس تھا اور مدتوں انہوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں اردو اور فارسی کے شعبوں کی رہنمائی کی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے علمی شغف کی بنا پر تدوین، تصنیف اور ترجمہ کے کاموں میں بھی مصروف رہے۔ غالب کی فارسی میں کئی کتابیں ہیں۔ اُن کا ایک دیوان اور خطوط بھی فارسی میں ہیں مگر یہ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کی رسائی سے دور ہیں۔ ہماری

کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُن کے تراجم مستند ادیبوں سے کرائیں۔ پروفیسر حنیف نقوی کے متعدد مضامین غالب انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ ''غالب نامہ'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی کتابیں بھی یہاں سے چھپ چکی ہیں اور یہ تمام تحریریں ہمارے لیے دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو بھی لکھا وہ کافی محنت سے لکھا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر اُن کی تحریریں ہمیں روشنی عطا کر رہی ہیں۔ ہم یہ کتاب اہل علم کی نذر کر رہے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ عرصے تک اپنی قدر و قیمت کی بنا پر اس کی ضرورت رہے گی۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

انتساب

اپنے ابتدائی درجات کے استاد

سید شہزاد حسین مرحوم

کے نام

جن کی شفقت و محبت کا نقش آج بھی تازہ ہے

ع مٹتا کہاں ہے صفحۂ دل پر لکھا ہوا

فہرست

تقریب

پروفیسر حنیف نقوی (۱۹۳۶ء۔۲۰۱۲ء) صفِ اول کے محقق اور اعلیٰ درجے کے غالب شناس تھے۔ دقتِ نظر، اصابتِ رائے اور تحقیقی حزم واحتیاط ان کی امتیازی صفات تھیں۔ عمر کے آخری عشرے میں غالب سے متعلق ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مثلاً:

۱۔ غالب کی چند فارسی تصانیف ۲۰۰۵ء

۲۔ غالب۔احوال وآثار (طبع دوم) ۲۰۰۷ء

۳۔ غالب اور جہانِ غالب ۲۰۱۲ء

دسمبر ۲۰۱۱ء میں انھوں نے 'تحقیق وتعارف' کے نام سے ایک کتاب کا مسودہ ترتیب دے کر اترپردیش اردو اکادمی میں جمع کیا تھا، لیکن اس سے قبل کہ اکادمی اس کی اشاعت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتی، ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۲ء کو انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ بالآخر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی توجہ سے دسمبر ۲۰۱۳ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے وہ کتاب شائع ہوگئی۔

نقوی صاحب مرحوم کا ارادہ تھا کہ 'غالب کے فارسی خطوط' کے عنوان سے بھی ایک

مجموعۂ مضامین شائع کریں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک فولڈر میں متعلقہ مضامین کی کتابت شدہ کاپیاں یکجا کر کے رکھ دی تھیں اور فولڈر کے اوپر کتاب کا نام لکھ کر نیچے کی سطروں میں مضامین کے عنوانات بھی ترتیب وار لکھ دیے تھے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کی اشاعت کے لیے نہ صرف آمادگی بلکہ اشتیاق کا اظہار کیا۔ اب یہ کتاب انھیں کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے۔ اس کے لیے وہ بجا طور پر شکریے کے مستحق ہیں۔

اردو کے نقادوں اور محققوں نے غالب کے احوال و آثار کی تحقیق و تجزیے کے لیے ان کے اردو خطوط کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور اس سے مفید نتائج بھی برآمد کیے ہیں، لیکن بہ قول پروفیسر حنیف نقوی غالب کے اردو خطوط ان کی زندگی کے صرف آخری بیس بائیس برسوں کے احوال و کوائف پر مشتمل ہیں۔ اس کے برعکس ان کے فارسی خطوط جوان کے عنفوان شباب سے لے کر پچاس سال سے کچھ زائد عمر تک کے نشیب و فرازِ حیات سے متعلق معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں، اب تک نہ تو اس دقتِ نظر کے ساتھ پڑھے گئے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں اور نہ ان سے اس قدر استفادہ کیا گیا ہے، جس کی گنجائش ان کے اندر موجود ہے۔

اسی احساس کے تحت پروفیسر نقوی نے پنج آہنگ، باغِ دودر، متفرقاتِ غالب، مآثرِ غالب اور نامہ ہاے فارسیِ غالب میں شامل فارسی خطوط کا بالاستیعاب اور بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور پھر وقتاً فوقتاً اپنے حاصلِ مطالعہ کو مختلف مضامین کی شکل میں پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کی بعض تحقیقات درج ذیل ہیں:

☆ غالب کے کل دستیاب فارسی خطوط کی تعداد ۳۵۴ ہے۔

☆ ان کا سب سے قدیم دستیاب فارسی خط ستمبر ۱۸۲۳ء کا ہے۔

☆ اردو میں خطوط نگاری سے برسوں پہلے غالب فارسی خطوط میں بھی رسمی القاب و آداب کو ترک کرنے اور ذوق ہم زبانی، کے انداز کو اختیار کرنے پر فخر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

☆ لنگی ایک عام ہندوستانی لباس ہے۔ غالب کے زمانے میں دہلی کے عام لوگ اسے دوپٹے کے طور پر استعمال کرتے اور کندھوں پر ڈال کر رکھتے تھے، لیکن غالب روشِ

عام سے انحراف کرتے ہوئے اُسے بہ طور دستار سر پر باندھنے کے کام میں لاتے تھے۔

☆ غالب ایامِ جوانی ہی میں رات کا کھانا ترک کر چکے تھے اور اتوار کے دن گوشت سے مکمل اجتناب برتتے تھے۔

☆ دو پہر کا کھانا وہ پابندی کے ساتھ کھاتے حتیٰ کہ قلعے کی ملازمت کے زمانے میں اگر کسی مصروفیت کی وجہ سے دو پہر کو گھر آنے کا موقع نہیں ملتا تھا تو بلا تکلف کسی شہزادے کے یہاں سے کھانا منگا لیا کرتے تھے۔

☆ قلعۂ معلیٰ کی ملازمت سے پہلے غالب شام کا وقت امین الدین احمد خاں کے ساتھ ان کے گھر پر گزارا کرتے تھے۔

☆ قمار خانہ قائم کرنے کے الزام میں اسیری کے واقعے سے پہلے غالب کے مکان پر رات کے وقت احباب کا اجتماع روز کا معمول تھا۔

☆ غالب کی والدہ ۲۹۔۱۸۲۸ء تک بہ قیدِ حیات تھیں اور وہ انھیں آگرے سے زرِ نقد کی صورت میں کچھ بھیجتی بھی رہتی تھیں۔

☆ کلکتے میں غالب کے خلاف ادبی معرکہ آرائی ایک منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھی، جس کے اصل بانی مبانی غالب کے حقیقی بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا افضل بیگ تھے، جو خواجہ حاجی کے برادرِ نسبتی تھے۔ وہ اس سازش کے ذریعے پنشن کے مقدمے میں اپنے بھانجوں یعنی خواجہ حاجی کے بیٹوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔

☆ یہ غلط مشہور ہے کہ کلکتے میں غالب کے کلام پر حریفوں کی طرف سے اعتراضات کی یلغار بر سرِ مشاعرہ ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کارروائی دوسرے مشاعرے کے ایک ہفتے کے بعد اور تیسرے مشاعرے سے تین ہفتے قبل شروع ہوئی تھی۔

☆ بعض محققین کا یہ بیان غلط ہے کہ کلکتے کے مذکورہ بالا مشاعرے ہفتہ بہ ہفتہ منعقد ہوتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا انعقاد ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ہوتا تھا۔

☆ فارسی خطوط کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اربابِ اقتدار اور اہلِ علم دونوں سے تعلقات قائم کرنے اور ایک بار نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو جانے کے بعد

اسے استوار رکھنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے۔ اعتقاد الدولہ نوروز خاں وابستۂ دربار اودھ ،نواب تجمل حسین خاں والیِ فرخ آباد ،نواب مختارالملک سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد ، امین الدولہ آغا علی خاں مہر صاحبزادۂ معتمد الدولہ اور شہزادہ بشیر الدین نبیرۂ ٹیپو سلطان سے ان کی فارسی خط و کتابت اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

☆ شیخ امام بخش ناسخ، مولانا فضل حق خیر آبادی، حسام الدین حیدر خاں، مرزا علی بخش خاں ،رائے چھج مل، مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا، مرزا احمد بیگ خاں طپاں، نواب علی اکبر خاں طباطبائی، مرزا ابوالقاسم خاں اور مولوی سراج الدین احمد، غالب کے ان احباب خاص میں ہیں جن کے نام انھوں نے اردو میں کوئی خط نہیں لکھا اور جن کے ساتھ غالب کے ربط و تعلق کا منظر نامہ ان کے فارسی خطوط کی مدد سے ہی تیار ہوا ہے۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا، وہ بہ طور مشتے از خروارے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیشِ نظر مجموعے میں شامل نقوی صاحب کا ہر مضمون کسی نہ کسی اہم انکشاف یا نادر تحقیق پر مبنی ہے۔ اس لحاظ سے اسے سرمۂ چشم بصیرت کہنا غلط نہ ہوگا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے غالب شناسی کی نئی جہتیں وا ہوں گی اور اہل نظر اسے قبول و استحسان کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

علی گڑھ
۳ جون ۲۰۱۵ء

ظفر احمد صدیقی

غالبؔ کی فارسی مکتوب نگاری

غالبؔ بلاشبہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نظم اور نثر دونوں پر انھیں جو بے پناہ قدرت حاصل تھی اور اظہار و ابلاغ کی جو غیر معمولی صلاحیت انھیں ودیعت ہوئی تھی، اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو میں طبع آزمائی سے کیا، لیکن پندرہ بیس برس کی مشق کے بعد جب فارسی گوئی کی طرف راغب ہوئے تو اردو سے دل چسپی کم ہوتے ہوتے بادشاہ یا ان کی بیگم کے ارشاد کی تعمیل یا بعض احباب کی فرمائش کی تکمیل تک محدود ہوگئی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اردو شاعری کو اپنے لیے باعثِ ننگ اور فارسی شاعری کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنے لگے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

نظم کے برخلاف نثر میں ابتدائے نگارش فارسی سے ہوئی اور اختتام اردو پر۔ دیوانِ ریختہ اور گلِ رعنا کے دیباچوں اور مختلف اردو کتابوں کی تقریظوں کے علاوہ خطوط کی زبان بھی ایک زمانے تک فارسی ہی رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غالبؔ کے اپنے خیال کے مطابق اردو میں

انشا پردازی و عبارت آرائی کے ذریعے اظہارِ کمال کے امکانات تقریباً مفقود تھے، لیکن جب ''پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگر کاوی کی قوت'' روبہ زوال ہونا شروع ہوئی تو انھوں نے مجبوراً فارسی کو خیر باد کہہ کر اردو کا سہارا لیا جو اس وقت تک ''زبانِ مروّج'' کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور جس میں ''سرسری'' اور ''تکلف سے بری'' انداز میں خامہ فرسائی ممکن تھی۔ اپنے پسندیدہ آئینِ نگارش سے اس انحراف کو انھوں نے کئی جگہ اپنے لیے کام کو آسان کر لینے سے تعبیر کیا ہے۔ چناں چہ ''پارسیِ آمیختہ بہ تازی'' میں خط کا جواب دینے کی فرمائش کے جواب میں منشی نول کشور کو لکھتے ہیں:

''اکنوں کہ دل از ناتوانی سگالش بر نمی تابد، کار بر خود آساں کردہ ام و ہر چہ می باید نبشت، در اردو می نویسم۔''

مولانا محمد عباس رفعتؔ کے نام کے ایک خط میں بھی انھوں نے اپنے معمول میں اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''از دیر باز نبشتنِ نثر بہ پارسی زباں آئینِ من نیست۔ نامہ ہا یکدست بہ اردو نبشتہ می شود۔''

فارسی کے بجائے اردو میں مکتوب نگاری کا یہ دور غالبؔ کی زندگی کے آخری بیس بائیس برسوں کو محیط ہے۔ ان بیس بائیس برسوں میں ان پر جو کیفیات گزریں اور وہ جن معاملات و مسائل سے دوچار ہوئے، ان کی تفصیل ان خطوط میں اپنی زیادہ تر جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ ان جزئیات نے غالبؔ کی شخصیت اور فکر و فن کے مطالعے میں غالب شناسوں کی جو مدد کی ہے، وہ کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں۔ اس کے برعکس فارسی زباں میں لکھے گئے وہ خطوط جو عنفوانِ شباب سے پچاس سال سے کچھ زائد عمر تک کے نشیب و فرازِ حیات سے متعلق معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں، اب تک نہ تو اس دقتِ نظر کے ساتھ پڑھے گئے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں، اور نہ ان سے اس قدر استفادہ کیا گیا ہے جس کی گنجائش ان کے اندر موجود ہے۔

فارسی کے ان خطوط کی جمع و تدوین کا نقطۂ آغاز ''پنج آہنگ'' ہے جس کا نقشِ اول ۱۲۵۱ھ (۳۶-۱۸۳۵ء) میں تیار ہوا۔ مختلف النوع تحریروں پر مشتمل اس مجموعے کے اولین نسخے یا

اب تک کی دریافت کے مطابق قدیم ترین نسخے میں صرف اٹھارہ خط شامل تھے۔ روزمرہ کی زندگی میں خطوط کی اہمیت اور ان کے رواجِ عام کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بہت کم تھی۔ خود اس مجموعے کے مرتّب مرزا علی بخش خاں کو بھی اس کا بہ خوبی احساس تھا۔ چناں چہ اس کے دوسرے آہنگ کے آغاز میں انھوں نے صراحتاً یہ لکھ دیا تھا کہ:

"دستورِ حضرت اخواں پناہی مدّ ظلّہٗ العالی آنست کہ در مکاتبات ہرگز مسودہ نہ می فرمایند و ہم چنیں قلم برداشتہ می نویسند۔ ناچار انچہ سرِ دست میسّر آمد، دریں آہنگ رقم می پزیرد و اوراق سادہ گزاشتہ می شود تا بعد ازیں انچہ دست بہم دہد، نگارش یابد و نیز بہ احباب اجازتِ ایں معنی دادہ می آید کہ ہرچہ از عباراتِ غالبی در زماں ہائے مختلف بہ نظر گزرد، آں را دریں آہنگ جا دہند و بر جامعِ ایں پنج آہنگ منت نہند۔"

اس اجازتِ عام کے بعد وقتاً فوقتاً "پنج آہنگ" کے جو قلمی نسخے تیار ہوئے، ان میں دوسری نگارشات کی بہ نسبت خطوط کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوتا رہا۔ تا آں کہ اگست سنہ ۱۸۴۹ء میں جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مطبعِ سلطانی، دہلی میں چھپ کر شائع ہوا تو یہ تعداد بڑھ کر ایک سو اٹھائیس ہو چکی تھی۔ تقریباً چار سال کے بعد اپریل سنہ ۱۸۵۳ء میں مطبع دار السلام، دہلی نے "پنج آہنگ" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس میں مزید پچیس خطوں کا اضافہ ہوا اور اس طرح ان کی مجموعی تعداد ایک سو ترپن ہو گئی۔ غالبؔ کی ان نگارشاتِ نثر کی عام پسندیدگی اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ منشی نول کشور "کلیاتِ غالب" کی اشاعت کے تقریباً چھے ماہ بعد دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء میں جب دہلی آئے تو ان کے کلیاتِ نثر یعنی "پنج آہنگ"، "مہرِ نیم روز" اور "دستنبو" کے مجموعے کا وہ خاص نسخہ جسے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے نہایت محنت اور توجہ سے مرتب کیا تھا، اُن سے عاریتاً حاصل کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور جنوری سنہ ۱۸۶۸ء میں اسے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے مطبع سے شائع مکرر دیا۔ چوں کہ سنہ ۱۸۴۸ء کے آس پاس یعنی "پنج آہنگ" کی اشاعتِ اول سے سال ڈیڑھ سال پہلے غالبؔ نے عام طور پر اردو میں خط لکھنا شروع کر دیا تھا اور فارسی میں کسی فرمائش یا

مصلحت کی بنا پر صرف کبھی کبھی خط لکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لیے ''کلیاتِ نثرِ غالب'' کی اس اشاعتِ اول میں، جسے ''پنج آہنگ'' کی اشاعتِ سوم بھی کہا جا سکتا ہے، صرف چودہ خطوں کا اضافہ ہوا۔ اس کلیاتِ نثر کا دوسرا ایڈیشن پہلی اشاعت کے تین برس اور غالب کی وفات کے تقریباً دو برس بعد جنوری سنہ ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا، جس میں مزید دو خط شامل ہوئے۔ ان سولہ خطوں کے اضافے کے ساتھ اس وقت تک شائع شدہ خطوط کی مجموعی تعداد ایک سو انہتر ہو گئی۔ اس کے بعد شائع ہونے والے ''پنج آہنگ'' کے کسی ایڈیشن میں اس تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

''باغِ دودر'' غالب کی نگارشاتِ نظم و نثرِ فارسی کا وہ آخری مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف ڈیڑھ سال قبل مرتب کیا تھا۔ اس میں وہ تمام نئی، پرانی تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں جو ''کلیاتِ غالب'' اور ''کلیاتِ نثرِ غالب'' کی اشاعت کے وقت کسی وجہ سے دستیاب نہیں ہو سکی تھیں یا اس کے بعد وجود میں آئی تھیں۔ اس کا واحد قلمی نسخہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی کی ملکیت تھا۔ عابدی صاحب نے پہلے اس کا حصۂ نظم اورینٹل کالج میگزین، لاہور کے اگست سنہ ۱۹۶۰ء کے شمارے میں اور حصۂ نثر اسی مجلّے کے اگست سنہ ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شائع کیا، بعد ازاں جولائی سنہ ۱۹۶۸ء میں اورینٹل کالج کے جشنِ صد سالہ کے موقعے پر اس کا مکمل متن مع حواشی، تعلیقات اور ترجمۂ خطوط کے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کی ''قسمتِ منثورات'' میں ساٹھ خط شامل ہیں۔ اس طرح ''پنج آہنگ'' کے بعد یہ غالب کے فارسی خطوط کا دوسرا بڑا مجموعہ ہے۔

غالب کی زندگی میں ترتیب پائے ہوئے ان دو مجموعوں کے علاوہ گذشتہ صدی کے پانچویں عشرے میں اور اس کے بعد ''متفرقاتِ غالب''، ''مآثرِ غالب'' اور ''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' کے نام سے ان کے مکاتیب فارسی کے تین اور مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو مجموعوں میں فارسی خطوط کے علاوہ فارسی و اردو کی کچھ اور تحریریں بھی شامل ہیں۔ تیسرا مجموعہ صرف فارسی خطوط پر مشتمل ہے۔ ان تینوں مجموعوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شامل خطوط غالب کے سفرِ مشرق اور قیامِ کلکتہ یا اس کے فوراً بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ جن بیاضوں یا مجموعوں کی صورت میں دستیاب ہوئے ہیں، انھیں دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے معاصرین نے ان کی زندگی کے اس ابتدائی دور ہی میں ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ کر لیا تھا اور وہ انھیں سرمۂ چشمِ بصیرت سمجھ کر محفوظ کرنے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ خود

غالبؔ کو یا ان کا کلامِ نظم ونثر جمع کرنے والے ان کے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی شخص کو اس بیش قیمت سرمائے کے تحفظ کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

متذکرۂ بالا مجموعوں میں سے پہلا مجموعہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے مرتب کر کے سنہ ۱۹۴۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن غالب صدی کے دوران سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں غالبؔ کی بعض دوسری تحریروں کے علاوہ انچاس فارسی خطوط شامل ہیں۔ ان میں سے بارہ خط معمولی لفظی اختلافات کے ساتھ اور دو متن کے غیر معمولی فرق کے ساتھ ''پنج آہنگ'' میں بھی موجود ہیں۔ اس طرح مشترک خطوط کو منہا کرنے کے بعد اس مجموعے کی وساطت سے پہلی بار منظرِ عام پر آنے والے خطوط کی تعداد پینتیس رہ جاتی ہے۔

دوسرے مجموعے ''مآثرِ غالب'' کے مرتب قاضی عبدالودود ہیں۔ یہ اولاً ''آثارِ غالب'' کے نام سے ''علی گڑھ میگزین'' کے ۴۹-۱۹۴۸ء کے خصوصی شمارے ''غالب نمبر'' کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقیِ اردو، صوبۂ بہار نے اسے ''مآثرِ غالب'' کے نام سے ایک مستقل مجموعے کے طور پر شائع کر دیا۔ ''مآثر غالب'' کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۹۵ء میں ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ کی طرف سے شائع ہوا۔ اس ترتیب جدید کی ذمے داری راقم السطور کے سپرد کی گئی تھی۔ پانچ برس کے بعد سنہ ۲۰۰۰ء میں ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی (پاکستان) نے مزید اضافہ وترمیم اور خطوط کے اردو ترجمے کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا۔ یوں تو اس مجموعے کی تمام ہی تحریریں اہم ہیں لیکن اس کا اصل سرمایہ اس کا حصۂ دوم ہے جو بتیس فارسی خطوط پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چار خط اس مجموعے اور ''متفرقاتِ غالب'' میں مشترک ہیں۔ باقی اٹھائیس خطوط اس مجموعے کے علاوہ کہیں اور دستیاب نہیں۔

تیسرے مجموعے ''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' کے مرتب سید اکبر علی ترمذی ہیں جو محکمۂ آثارِ قدیمہ، نئی دہلی سے بہ حیثیت ڈائریکٹر وابستہ تھے۔ انھوں نے قاضی عبدالودود کے حسب خواہش اکتوبر سنہ ۱۹۶۸ء میں اس کام کی ذمّے داری سنبھالی اور مقدمے کے اختتام پر درج تاریخ کے مطابق ۱۴ر فروری سنہ ۱۹۶۹ء کو اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اسی سال غالب اکیڈمی، نئی دہلی کی طرف سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس مجموعے میں شامل خطوط کی مجموعی تعداد اکتیس ہے۔ ان میں سے آٹھ کلی یا جزوی طور پر اس مجموعے اور ''پنج آہنگ'' کے درمیان مشترک ہیں۔ باقی تیئیس

خط اس سے قبل دستیاب ذخیرۂ خطوط پر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''پنج آہنگ'' کے آخری اضافہ شدہ ایڈیشن اور ''باغ دودر'' کے نسخۂ مطبوعہ میں شامل خطوں کی مجموعی تعداد دو سو انتیس تھی۔ ان تینوں مجموعوں کے توسط سے اس میں چھیاسی خطوط کا اضافہ ہوا۔ اس طرح یہ تعداد بڑھ کر تین سو پندرہ ہوگئی۔ ان کے علاوہ اب تک چالیس خطوط اور دریافت ہو چکے ہیں جو مختلف بیاضوں، کتابوں اور رسالوں میں منتشر ہیں۔ انھیں شامل کرنے کے بعد کل دستیاب فارسی خطوں کی تعداد تین سو پچپن ہو جاتی ہے۔ غالبؔ کے ذوقِ خامہ فرسائی اور مدتِ عمر کو دیکھتے ہوئے ان خطوط کو جو شمار میں صرف ایک سالِ ہجری کے دنوں کے برابر ہیں، مشتے نمونہ از خروار قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس قلتِ تعداد کے باوجود ان خطوں میں غالبؔ کی زندگی اور سیرت و شخصیت نیز ان کے عہد کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں معلومات کا جو گراں قدر سرمایہ محفوظ ہے، اس کا کوئی بدل نہیں۔ اس سرمائے سے استفادے کے بغیر نہ تو فارسی و اردو کے اس بلند قامت شاعر و ادیب کی ذات و صفات کے رنگا رنگ پہلوؤں کا عرفان و ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے زمانے کی شایانِ شان تہذیبی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

مکتوب نگار کی حیثیت سے غالبؔ کی شہرت بنیادی طور پر ان کے طرزِ نگارش کی رہینِ منت ہے۔ یہ طرزِ نگارش جسے انھوں نے اردو خطوط میں کہیں زبانِ قلم سے باتیں کرنے اور ہجر میں وصال کے مزے لینے سے تعبیر کیا ہے اور کہیں مراسلے کو مکالمہ بنا دینے کا نام دیا ہے، ان کی انفرادیت کی سب سے بڑی شناخت ہے۔ اردو میں خطوط نگاری کے آغاز سے برسوں پہلے بھی جب کہ وہ فارسی زبان پر قدرتِ کاملہ کے اظہار اور ''سخن آرائی و خودنمائی'' کی غرض سے اپنی فارسی تحریروں کی نوک پلک درست کرنے میں غیر معمولی ''محنت پژوہی و جگر کاوی'' سے کام لینے کے عادی تھے، فطری طور پر انھیں مکتوب نگاری کا یہی بے ساختہ اور بے تکلف انداز پسند تھا۔ ''پنج آہنگ'' کے آہنگِ اول ''در القاب و آداب و ما یتعلق بہا'' میں جو علی بخش خاں کی فرمائش پر ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) میں قلم بند کیا گیا تھا اور جس کا مقصد نوآموز نامہ نگاروں کے لیے ''القاب و آدابِ متعارفۂ رسمیہ'' کی واقفیت کی غرض سے ایک دستور العمل مرتب کرنا تھا، انھوں نے اپنے اس شیوۂ خاص کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:

''هنجارِ من در نگارش این است کہ چوں کلک و ورق بہ کف گیرم، مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ فراخورِ حالتِ اوست، در سرآغازِ صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنجِ مدّعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو و زائد است۔''

القاب و آداب کے مرحلے سے آگے بڑھ کر عرضِ مدّعا کے معاملے میں بھی ان کے اپنے کچھ اصول و آداب تھے، مثلاً یہ کہ تحریر کو تقریر سے زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہیے۔ بات اس انداز میں کہی جائے کہ مکتوب الیہ کے لیے اس کا سمجھنا دشوار نہ ہو اور واقعات کے بیان میں ان کی اہمیت کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر ملحوظ رکھی جائے۔ فرماتے ہیں:

''نامہ نگار را آں باید کہ نگارش را از گزارش دور تر نہ بردہ نبشتن را رنگِ گفتن دہد و مطلب را بداں روش گزارد کہ دریافتنِ آں دشوار نہ بود و اگر مطلبے چند داشتہ باشد، در تقدیم و تاخیر ژرف نگہی بہ کار بردو ازاں پرہیزد کہ سخن گرہ در گرہ گردد و اجزاے مدّعا بہم فرو خورد۔''

بہ حالتِ موجودہ غالبؔ کے جتنے فارسی خطوط دستیاب ہیں، ان میں سنہ ۱۸۲۵ء سے پہلے کا کوئی خط شامل نہیں، اس کے باوجود انھوں نے مختلف خطوں میں جس طرح بار بار اپنی اس روشِ خاص کا تذکرہ کیا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کا سوچا سمجھا اسلوبِ تحریر تھا اور وہ بہ طورِ عموم شروع ہی سے اس پر کاربند تھے۔ محمد علی خاں صدر امینِ باندا کے نام کلکتے سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''از تکلفاتِ رسمیہ کہ عبارت از القاب و آداب است، دست باز کشیدہ پرسیدہ و ناپرسیدہ شرح می دہم۔''

انھی محمد علی خاں کے نام کے ایک اور خط میں رقم طراز ہیں:

''من و خدا کہ ہنگامِ تحریرِ عبودیت نامہ بس کہ ذوقِ حضور از ضمیرم می جوشد، ہرگز رعایتِ القاب و آداب را گنجائی نہ می ماند۔ چہ من آں می

خواہم کہ نبشتن کم از گفتن نہ باشد۔''

مکتوب نگاری کے وقت ''ذوقِ حضوری'' کی اس کیفیت کو جسے ایک اور موقعے پر انھوں نے ''ذوقِ ہم زبانی'' سے تعبیر کیا ہے، غالبؔ ایک ایسی دولتِ بیدار تصور کرتے ہیں جو خاص ان کا سرمایہ ہے۔ انھیں اس پر ناز ہے کہ وہ رسم وراہِ دہر کی پابستگی سے آزاد ہیں اور ایک ایسی روش پر چل رہے ہیں جو ان کے اور ان کے مکتوب الیہ کے درمیان سے فاصلوں کی تمام بندشیں اور دوئی کے سارے حجابات اٹھا دیتی ہے۔ رائے چھج مل کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''نہ پندارند کہ ہم چو پابستگانِ رسم و راہِ دہر دست بہ نامہ نگاری آلائیم۔ حاشاثم حاشا تابِ ایں مایہ دوری نہ دارم۔ اینک رائے چھج مل را رو بہ روے خویش می بینم واز ہر در بہ سخن در پیوستہ ام۔''

منشی رحمت اللہ خاں کے نام کے ایک خط میں اسی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے:

''همانا بزمِ انسِ فرزانہ یگانہ در اندیشہ می گزرانم وخود را با خواجہ ہم نشین وہم سخن اندیشیدہ بہ زبانِ خامہ کہ ہم چو دلِ نگارندۂ نامہ دونیم است، داستانِ دردِ دل می خوانم۔''

قلم کو زبان کا ہم منصب بلکہ نعم البدل بنا دینے کی یہ سعیِ مشکور غالبؔ کا وہ مہتم بالشان کارنامہ ہے جس کی دوسری مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ اس وصفِ خاص کی بدولت یہ خطوط غالبؔ کے شب وروز کی زندہ اور متحرک تصویروں کا آئینہ خانہ بن گئے ہیں۔ اس نگار خانۂ ہزار رنگ کی ایک جھلک کے طور پر جاڑے کے موسم میں صبح کے وقت غالبؔ کی نشست گاہ کا یہ منظر قابلِ دید ہے:

''صبح است۔ پردہ ہاے ایواں فروہشتہ و در منقل آتشے افروختہ ومن بر کنارِ منقل نشستہ و دست بر آتش داشتہ۔ خاور سوے پردہ بالا زدہ اندو پر تومہرِ جہاں تاب زاویہ را فرو گرفتہ۔''

لنگی ایک عام ہندوستانی لباس ہے جسے آج کل پاجامے کے متبادل کے طور پر استعمال

کیا جاتا ہے۔ غالب نے منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام کے ایک اردو خط میں ان سے سوال کیا ہے کہ ''کیوں صاحب! وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟'' ایک عام قاری اسے پڑھ کر یہ راے قائم کرنے میں حق بہ جانب ہوگا کہ غالب کبھی کبھی لنگی بھی باندھا کرتے تھے۔ لیکن ان کے فارسی خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں جس قسم کی لنگی مطلوب تھی، ان کے زمانے میں اس کا یہ مصرف نہ تھا۔ دہلی کے عام لوگ اسے تہبند کی بجاے دوپٹے کے طور پر استعمال کرتے اور کندھوں پر ڈال کر نکلتے تھے۔ بعض دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی غالب کی پسند سب سے مختلف تھی۔ وہ اسے بہ طور دستار سر پر باندھنے کے کام میں لاتے تھے۔ جوہر ہی کے نام کے ایک فارسی خط میں اپنی اس روشِ خاص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''من لُنگ از بہرِ آں می خواہم کہ بسر پیچم و معمّم خرام۔ چوں دہلویان بر دوش نہ می افگنم۔''

ایک دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دستار کبھی کبھی دو لنگیوں کو جوڑ کر تیار کی جاتی تھی اور غالب کے پسندیدہ ترین لباس میں شامل تھی۔ ۲۶ر دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء کو انھیں ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں کی بھیجی ہوئی دو لنگیاں موصول ہوئیں۔ ان سے دستار تیار کرا کے جلد از جلد سر پر باندھنے کے سلسلے میں انھوں نے جس غیر معمولی اشتیاق اور بے تابی کا مظاہرہ کیا، اس سے لباس اور وضع قطع کے معاملے میں ان کے حسنِ اہتمام اور ذوقِ خودنمائی کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''نیمہ از روز سپری شدہ بود...... کہ بدیں گنجِ بادآورد تونگر شدم۔ شکیب نہ توانستم ورزید و خود را از خودنمائی نگہ نہ توانستم داشت۔ دردم آدم بہ بازار فرستادم و ابریشمِ سبز طلبیدم و فرماں دادم کہ ہر دو پارہ را بہم دوزند۔ رفتند و آوردند و دوختند و نوردیدند و بہ من سپردند۔ آئینہ پیشِ رو نہادم و بہ سر پیچیدم و کلہ بر آسماں فگندم و ہم بدیں صورت کہ گفتم، بہ نامہ نگاری روے آوردم۔''

غالب کی خوراک کے بارے میں مولانا حالی کا بیان ہے:

"مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے...... اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہوگئی تھی...... دن کو جو کھانا ان کے لیے گھر میں سے آتا تھا، اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا...... شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب۔ بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔"

حالؔی کی فراہم کردہ اس معلومات کے برخلاف مرزا احمد بیگ طپاںؔ کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایامِ جوانی ہی میں رات کا کھانا ترک کر چکے تھے اور اتوار کے دن گوشت سے مکمل اجتناب برتتے تھے۔ قیامِ کلکتہ کے دوران طپاںؔ کے ایک دعوت نامے کے جواب میں لکھتے ہیں:

"بندہ را در طعامِ امروزہ دو عذرِ صریح است، یکے ایں کہ بہ شب مبادرت در اکلِ غذا نہ می کنم ہرگز۔ دوم امروز (کہ) روزِ یک شنبہ است، از اکلِ لحم اجتناب دارم۔"

اس بیان کی تائید مولوی محمد علی خاں صدر امینِ باندا کے نام ۲۶ را کتوبر سنہ ۱۸۲۸ء کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے اپنی مالی پریشانی اور روزمرہ کے ضروری اخراجات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں یہ اطلاع دی ہے:

"سہ خدمت گار و یک کہار ایدوں با من ماندہ و من نیز اگر غلط نہ کنم، بجائے خود نیمہ آدم بہ شمار تو انم آمد۔ چہ بنی نوع من اقلِ مرتبہ در شبا روز دو بار تنورِ معدہ می تابند......"

خود کو 'نیمہ آدم' یعنی آدھا آدمی شمار کرنے کی اس کے علاوہ اور کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ عامۃ الناس کے برخلاف غالبؔ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے۔
دوپہر کے کھانے کے معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔ حتٰی کہ قلعے کی ملازمت کے زمانے

میں بھی اگر کسی مصروفیت کی وجہ سے دو پہر کو گھر آنے کا موقع نہیں ملتا تھا تو بلا تکلف کسی شہزادے کے یہاں سے کھانا منگا لیتے تھے۔ تفتہ کے نام ۱۸ر جولائی سنہ ۱۸۵۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"ہر روز صبح بہ قلعہ ہمی روم۔ گاہے نان از خانۂ شاہزادگان بہ دریوزہ می خورم و شام گاہ بہ غم کدہ می آیم و روزے کہ ہنگامِ نیم روز نان بہ کاشانہ می خورم، پایانِ روز می روم۔"

قلعۂ معلّٰی کی ملازمت سے پہلے غالب شام کا وقت نواب امین الدین احمد خاں کے ساتھ ان کے گھر پر گزارا کرتے تھے۔ اپنے اس معمول کا ذکر انھوں نے رائے چھج مل کے نام کے ایک خط میں ایک اور واقعے کے ذیل میں ضمناً اس طرح کیا ہے:

"دیروز آخرِ روز چناں کہ خوے من است، بہ خانۂ نواب امین الدین خاں می رفتم۔ درعرضِ راہ خواجہ رحمت صاحب را یافتم۔"

قمار خانہ قائم کرنے کے الزام میں اسیری کے واقعے سے پہلے غالب کے مکان پر رات کے وقت احباب کا اجتماع روز کا معمول تھا۔ سنہ ۱۸۴۷ء کے اواخر میں قید سے رہائی کے کچھ دنوں بعد جب وہ پھاٹک حبش خاں میں واقع شعبان بیگ کی حویلی سے ترکِ سکونت کر کے گلی قاسم جان میں میاں کالے کی حویلی میں اُٹھ آئے تو یہ مجلس برہم ہوگئی۔ منشی جواہر سنگھ جوہر نے ایک بار اس محفلِ شبانہ کے شرکا کی خیر و عافیت دریافت کی، اس کے جواب میں انھیں ۶ر فروری سنہ ۱۸۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میر احمد حسین کہ ہم نواے شماست و میکش تخلص می کند، بہ لکھنؤ رفتہ است...... غیاث الدولہ حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر التزامِ ہر شبہ قدم رنجہ فرمائی نہ دارند۔ گاہ گاہ می آیند... از نقلِ مکاں بزم برہم خورد۔ آں جمعیتِ احباب نہ ماند۔"

فارسی کے ان خطوط میں غالب کے روزانہ کے معمولات سے متعلق ان چھوٹے چھوٹے واقعات کے علاوہ ان کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں نیز ان کے خاندان کے افراد اور ان کے دوستوں اور ساتھیوں کے بارے میں بھی بہت سی ایسی معلومات محفوظ ہیں جن کی طرف اب

تک مناسب توجہ نہیں دی گئی ہے۔ مثلاً حکیم وارث علی خاں اکبر آبادی غالبؔ کے ایامِ مکتب نشینی کے ساتھیوں میں سے تھے لیکن ان کا ذکر ان کے کسی سوانح نگار کے یہاں نہیں ملتا۔ تفتہ نے آگرے کے قیام کے زمانے میں لکھے ہوئے ایک خط میں ان کے حوالے سے کوئی بات لکھی تو غالبؔ نے ۱۷ رنومبر سنہ ۱۸۵۰ء کو انھیں حکیم صاحب موصوف سے اپنے روابط کے بارے میں یہ معلومات فراہم کیں:

''روشن گہر، گرامی دودماں حکیم وارث علی خاں کہ ذکرِ وے تقریباً بہ زبانِ کلکِ گہر فشانِ شما رفت...... غالبؔ آوارۂ بے نام ونشاں را بمنزلۂ حقیقی برادراست و باجاں برابر، بلکہ از جانِ گرامی عزیز تر...... از یک استاد فیض اندوختہ ایم و در یک دبستاں دانش آموختہ۔ اگر ہزار سال گزردو بہم نہ پیوندیم و بہ نامہ و پیام ہم دگر رایاد نہ کنیم، بیگانگی فراموش خواہد بود و دل از مہر ہم چناں بہ جوش۔''

مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرۂ حبیب گنج میں غالبؔ کا ایک فارسی خط محفوظ ہے، جس کا حوالہ ان کی والدہ کے نام اور زمانۂ وفات کے سلسلے میں بار بار دیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب کی تحریر کے مطابق ''اس کے آخر میں جو تاریخ پائی جاتی ہے وہ بہ ظاہر ی ۳۱ جنوری سنہ ۱۸۰۴ء ہے۔'' موصوف نے بہ دلائل ثابت فرمایا ہے کہ ''۱۸۰۴ء کا سال کسی عنوان سے ٹھیک نہیں ہو سکتا'' اور بالآخر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ خط سنہ ۱۸۴۰ء کی تحریر ہے۔ سنہ ۱۸۰۴ء کے خلاف اور سنہ ۱۸۴۰ء کی تائید میں انھوں نے جو دلیلیں پیش کی ہیں، ان میں سے سنہ ۱۸۰۴ء کے خلاف اس ایک دلیل کے علاوہ کہ اس پر غالبؔ کی وہ مہر ثبت ہے جو سنہ ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۶-۱۸۱۵ء میں تیار ہوئی تھی، کوئی دلیل قطعی اور مسکت نہیں۔ لیکن بعض حضرات اس دلیل کو بھی تسلیم نہیں کرتے، چناں چہ ان کا اصرار ہے کہ ی ۳۱ جنوری سنہ ۱۸۰۴ء ہی اس کی صحیح تاریخ ہے۔ چوں کہ غالبؔ نے اس خط میں اپنی والدہ کا ذکر اس ''امرِ ناگزیر'' کے حوالے سے کیا ہے جو ''لازمۂ نفوسِ بشری'' ہے، اس لیے بدیہی طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ اُن کے زوالِ عمر کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ فارسی کے بعض خطوط میں ہمیں ان کی موجودگی کے متعلق جو اشارے ملتے ہیں،

ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۸۲۸ء تک بہ قیدِ حیات تھیں۔ محمد علی خاں کے نام ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۲۸ء کے خط میں غالب نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی حالتِ دیوانگی میں غیر متوقع افاقے کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ان کے بعض معمولات میں نمایاں تبدیلی اور خواتینِ خانہ کے ساتھ ان کے برتاؤ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''از بول و براز احتراز داشتن و نان بر مائدہ خوردن (و زن و دختر و مادر را) زن و دختر و مادر دانستن ملکۂ او گشتہ است۔''

اس بیان سے ظاہر ہے کہ مرزا یوسف کی والدہ اس وقت زندہ اور دہلی میں موجود تھیں۔ یہ اطلاع ضمناً ہماری معلومات میں یہ اضافہ بھی کرتی ہے کہ وہ آگرے سے وقتاً فوقتاً دہلی آتی رہتی تھیں۔ اس خط کی تحریر کے تقریباً چودہ مہینے کے بعد جون سنہ ۱۸۲۹ء میں غالب انھی محمد علی خاں کو یہ اطلاع دیتے ہیں:

''ہفتۂ گزشت کہ...... ہنڈوی از اکبر آباد رسید۔ چوں وا رسیدم، چہار صد و ہفتاد و پنج روپیہ بود۔''

علائی کے نام کے ایک اردو خط سے جو ۲۷ر جولائی سنہ ۱۸۶۲ء کا لکھا ہوا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی غالب کی والدہ انھیں آگرے سے زرِ نقد کی صورت میں کچھ بھیجتی رہتی تھیں۔ بہ ظاہر چار سو پچھتر روپے کی یہ رقم بھی انھوں نے ہی بھیجی ہوگی۔ اس طرح فارسی کے ان دو خطوں کے حوالے سے جون سنہ ۱۸۲۹ء تک ان کا زندہ ہونا بہ قیاساتِ صریحی ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس امر کے باور کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ غالب کی یہ متنازعہ فیہ تحریر ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۰۴ء کو لکھی گئی ہوگی۔

کلکتے کا ادبی معرکہ غالب کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن اس معرکے میں غالب کے اصل حریف کون تھے، یہ بات ماضی قریب تک واضح نہ تھی۔ مختلف سوانح نگاروں نے سنی سنائی روایات کے سہارے جن لوگوں کو اس میدانِ کارزار میں اتارا تھا، ان میں سے کسی کی اس موقعے پر موجودگی کا کوئی حتمی ثبوت موجود نہ تھا۔ حتیٰ کہ بنگال کے ایک فاضل مصنف نے خود مرزا قتیل کو جو غالب کے ورودِ کلکتہ سے پورے دس سال قبل ۳۱ر جنوری سنہ ۱۸۱۸ء

کو وفات پا چکے تھے، ان کے مقابل لا کھڑا کیا تھا۔ راقم السطور نے اس دور کے فارسی خطوط کے غائر مطالعے کے بعد فروری سنہ ۱۹۹۹ء میں غالبؔ کے دو صد سالہ جشنِ ولادت کے موقعے پر ''غالبؔ اور معارضۂ کلکتہ'' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کر کے پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ اس ہنگامے کے اصل بانیِ مبانی غالبؔ کے حقیقی بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی اور خواجہ حاجی کے برادرِ نسبتی مرزا افضل بیگ تھے اور اس مہم میں انھیں مولوی سراج الدین احمد کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ان فارسی خطوط ہی کی مدد سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ یہ معرکہ دراصل غالبؔ کے خلاف ایک منصوبہ بند سازش کا حصہ تھا جو مرزا افضل بیگ نے پنشن کے مقدمے میں اپنے بھانجوں یعنی خواجہ حاجی کے بیٹوں کو فائدہ پہنچانے کی نیت سے تیار کی تھی۔ انھوں نے پہلے تو غالبؔ کو سنّیوں کے درمیان غالی شیعہ اور شیعوں کے حلقے میں صوفی اور ملحد مشہور کر کے مذہبی نقطۂ نظر سے ایک ناپسندیدہ شخصیت قرار دینے کی کوشش کی۔ جب یہ حربہ کارگر نہ ہوا تو انھیں ادبی حلقوں میں بدنام کرنے کے لیے مولوی سراج الدین احمد کے ساتھ مل کر اس مشاعرے کی طرح ڈالی جو اس معرکے کے لیے میدانِ کارزار ثابت ہوا۔ افضل بیگ کا ذکر واضح طور پر محمد علی خاں کے نام کے ایک خط میں موجود ہے۔ مولوی سراج الدین احمد کا ان کے ساتھ اس معرکے میں شریک ہونا بعض تحریروں سے بالواسطہ طور پر ثابت ہوتا ہے۔ محمد علی خاں کے نام کے متذکرہ بالا خط میں غالبؔ کا بیان ہے:

> ''یکے از اقربائے مولوی عبدالکریم خاصۃً از بہرِ تذلیل و تخریبِ من انجمنے بنا نہادہ و مشاعرہ قرار دادہ، رقعہ ہا بہ شعرائے کلکتہ نوشت و مرا نیز دعوت کرد۔''

مذکور الصدر مکتوب الیہ کے نام کے ایک اور خط مورخہ ۱۴ر اگست سنہ ۱۸۲۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سراج الدین احمد مولوی عبدالکریم کے بھتیجے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ''یکے از اقربائے مولوی عبدالکریم'' سے ان کے علاوہ کوئی اور مراد نہیں ہو سکتا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ غالبؔ کے اوّل الذکر خط کے مطابق مرزا افضل بیگ بھی مولوی عبدالکریم کے ''ہم خانہ'' تھے۔ یہ صورتِ حال غالبؔ کے ان دونوں حریفوں میں قریبی تعلق کا ایک

اور ثبوت فراہم کرتی ہے۔

اس معرکے کے سلسلے میں یہ بات بھی تواتر کے ساتھ دوہرائی جاتی رہی ہے کہ غالبؔ کے کلام پر حریفوں کی طرف سے اعتراضات کی یلغار برسرِ مشاعرہ ہوئی تھی۔ ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ بھی محض ایک مفروضہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کارروائی دوسرے مشاعرے کے ایک ہفتے کے بعد اور تیسرے مشاعرے سے تین ہفتے قبل شروع ہوئی تھی۔ تیسرے مشاعرے کے موقعے پر جب غالبؔ نے ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی تو سفیرِ ہرات ان کی تائید وحمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بہ غرضِ اثباتِ مدعا اساتذہ کے چند اشعار پیش کر کے مخالفین کی زبانیں بند کر دیں۔ اس ضمن میں بعض محققین کا یہ ارشاد بھی محلِ نظر ہے کہ یہ مشاعرے ہفتہ بہ ہفتہ منعقد ہوتے تھے۔ اس سلسلے کے خطوط میں سے ایک خط میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ یہ محفل ''در ہر ماہِ شمسیِ انگریزی روزِ یکشنبہ نخستیں'' یعنی ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو آراستہ ہوتی تھی۔

کلکتے کے ان ہنگاموں نے غالبؔ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے مقدمۂ پنشن کی پیروی کے لیے وہاں گئے تھے اور اسے کامیابی سے ہم کنار دیکھنے کے لیے رات دن سرگرمِ عمل تھے، لیکن ان کے حریفوں نے انھیں اختلافِ عقائد، نام اور تخلص کی تبدیلی اور زبان ولغت کے مسائل سے بے خبری جیسے معاملات میں الجھا کر اس ذہنی یک سوئی سے محروم کر دیا تھا جو اس مہم کو پوری تن دہی کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے درکار تھی۔ جب حالات کی یہ خرابی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو بعض بزرگوں کے مشورے کے مطابق انھوں نے رفعِ شر کی غرض سے ایک مثنوی لکھی جو ''بادِ مخالف'' کے نام سے ان کے کلیات میں شامل ہے۔ اس مثنوی کا اختتام اس شعر پر ہوا ہے:

آشتی نامۂ و داد پیام
ختم شد، والسّلام والاکرام

مالک رام نے اس شعر کے حوالے سے ''ذکرِ غالب'' میں لکھا ہے کہ جب یہ مثنوی لکھی گئی تو اس کا نام ''آشتی نامہ'' تھا۔ کلیاتِ غالب میں شامل کرتے وقت اسے بدل کر ''بادِ مخالف'' کر دیا گیا۔ ایک معاصر مصنف کو ان کے اس خیال سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک کسی مستند حوالے کے بغیر عنوان کا یہ استخراج درست نہیں۔ ''نامہ ہائے فارسیِ غالب'' کی ایک تحریر سے

معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام نے بربنائے قیاس جو بات کہی تھی، وہ واقعے کے عین مطابق ہے۔

کلکتے کے اس معرکے کے بعد ہی غالب کو عملاً اس بات کا تجربہ ہوا کہ زندگی کے اہم معاملات میں رائے عامّہ کی کیا اہمیت ہے اور اہلِ علم اور بارسوخ حضرات سے خوش گوار تعلقات کیا معنی رکھتے ہیں۔ وہ پہلے بھی اس حقیقت سے بے خبر اور مقتضیاتِ وقت سے بے نیاز رہنے والے شخص نہیں تھے، لیکن ان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت انھیں حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے روکتی رہتی تھی۔ کلکتے کے اس تلخ تجربے نے ان پر یہ حقیقت واضح کردی کہ

نہ ہر جاے مرکب تواں تاختن

کہ جاہا سپر باید انداختن

غالباً انھی واقعات کا اثر تھا کہ اس کے بعد اس قسم کے معاملات میں ان کا رویہ کسی قدر نرم ہوگیا اور وہ شعوری وارادی طور پر اس بات کو بے حد اہمیت دینے لگے کہ ان کا کون سا قدم ان کی شہرت وناموری میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے اور کس محاذ پر کس مرحلے تک پہنچ کر پس پائی اختیار کرلینا مناسب ہے۔ پیشِ نظر فارسی خطوط کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب زندگی کے آخری ایام تک اربابِ اقتدار اور اہلِ علم دونوں سے تعلقات قائم کرنے اور ایک بار نامہ وپیام کا سلسلہ شروع ہوجانے کے بعد اسے استوار رکھنے کی فکر میں سرگرداں رہے۔ اس کوشش کا مقصد حصولِ شہرت بھی تھا اور جلبِ منفعت بھی۔ ملک کے گوشے گوشے میں ان کے دوستوں، شاگردوں اور قدردانوں کی موجودگی میں ان کے ادبی مرتبہ ومقام کے علاوہ اس شعوری کوشش کے دخل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس معاملے میں بھی ان کی سرگرمیوں کا مطالعہ اردو کی بہ نسبت فارسی خطوں کی روشنی میں زیادہ بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے۔

اعتقادالدولہ نوروز علی خاں دربارِ اودھ سے منسلک ایک بااثر شخصیت تھے۔ غالب کو منشی محمد حسن خاں سے جو کسی کام کے سلسلے میں لکھنؤ سے دہلی آئے ہوئے تھے، یہ معلوم ہوا کہ صاحبِ موصوف نے ان سے یہ فرمائش کی ہے کہ جب دہلی سے واپس آئیں تو غالب کی کوئی تصنیف بہ طور ''رہ آورد'' ضرور اپنے ساتھ لائیں۔ غالب نے اس موقعے کو اعتقادالدولہ سے روابط کے قیام کا بہترین وسیلہ خیال کرتے ہوئے بہ عجلتِ تمام ''پنج آہنگ'' کی ایک نقل تیار کرائی اور منشی محمد حسن خاں کی معرفت ان کی خدمت میں روانہ کردی۔ اس کے ساتھ ہی علیحدہ سے ایک

خط بھی لکھا جس میں اس کتاب کے بھیجنے کی اطلاع بھی دی گئی ہے اور اس بات پر اظہارِ افسوس بھی کیا گیا ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے کتاب کی مناسب تزئین و آرائش نہیں کی جا سکی۔ لکھتے ہیں:

''یکے از برادراں بہ خواہشِ خود نہ بہ فرمانِ من عمرِ خود بہ فراہم آوردنِ نثرِ من تبہ کردہ ورقے چند چوں نامۂ کردارِ من سیہ کردہ است۔ آں اوراق ازاں گرامی برادر بیع خواستم و صحیح نویسے را براں داشتم کہ ہر چہ زودتر ایں نگارش را بہ پایاں رساند۔ ہر چندمی بایست کہ کاغذِ کتاب رنگین و نقش و نگار و اوراق زرّیں بودے، لیکن چوں مخدومِ ممدوح را پائے در رکاب و روئے بہ راہ بود، فرصتے ہم نہ داد کہ بہ رنگ آمیزی و نقش انگیزی وفا تواند کرد۔''

نواب تجمل حسین خاں حشمت جنگ والیٔ فرخ آباد سے تعلقات استوار کرنے کی تحریک امداد علی خاں کی گفتگو سے ملی جو فرخ آباد سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی نواب صاحب کی بزم میں اکثر اپنا ذکر آنے اور کلام پڑھے جانے کی اطلاع غالبؔ کے لیے جس مسرت آمیز ردِ عمل کا سبب بنی، اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے کیا جا سکتا ہے:

''خانِ رازداں را بہ زباں گزشت کہ حضرت نوابِ عالی جناب معلی القاب را نامِ غالبؔ اغلب بر زبان می گزرد و گفتارِ آں آشفتہ نوا دراں بزم خواندہ می شود۔ ہر آئینہ گاہے نامِ خود را بہ نام آوری می ستایم کہ برآں زبانِ معجز بیاں گزشت و گاہے بر گفتارِ خود حسد می برم کہ پیش از من روشناسِ آں انجمن گشت۔''

غالبؔ نے غائبانہ روشناسی کے اس حوالے کو وسیلہ بنا کر امداد علی خاں کے توسط سے ''سرمایۂ چہل سالہ جگر کاویٔ خویش یعنی مجموعۂ اشعارِ فارسی'' بہ طور ''ارمغانِ درویش بہ سلطاں'' نواب صاحب کی خدمت میں روانہ کیا تا کہ ''درویش نوازی صورتِ وقوع گیرد و ارمغاں بہ

مرحبا تلاقی پزیرد۔‘‘

حبیب اللہ ذکاؔ نواب مختارالملک سالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد کے میر منشی تھے۔ جب وہ غالبؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور نواب صاحب کے دفتر کی معرفت خط و کتابت شروع ہوئی تو غالبؔ نے ایک خط میں ان سے نواب صاحب کے مذاقِ سخن اور قصیدہ بھیجنے کی صورت میں صلے کی امید کے بارے میں استفسار کیا۔ ذکاؔ نے اس کے جواب میں یہ اطلاع دی کہ:

’’جنابِ وزارت کی طبیعت سخن داں ہے اور شیوۂ سخن سے اس قدر رغبت ہے کہ اگر طومارِ سخن یوم النشور تک طولانی ہو تب بھی اس کے دیکھنے کو آج سے کل پر نہیں ٹالیں گے۔‘‘

نواب صاحب کی سخن دوستی کے بارے میں یہ خوش کن اطلاع غالبؔ کی خواہش کے عین مطابق تھی، چناں چہ انھوں نے تریسٹھ اشعار پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ موصوف کی خدمت میں اس توقع کے ساتھ ارسال کیا کہ یہ ان کے لیے قدر دانی کا وسیلہ ثابت ہوگا۔ اتفاقِ وقت کہ قصیدہ پہنچنے کے چند دنوں کے اندر نواب صاحب کے خسر میر غلام حسین خاں کا انتقال ہو گیا، جس کے نتیجے میں غالبؔ کو سرکاری طور پر اس قصیدے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل سکی، لیکن ذکاؔ کے خطوط سے انھیں برابر حالات کا علم ہوتا رہا۔ اس قسم کے معاملات میں تاخیر کا تحمل غالبؔ کے مزاج کے منافی تھا۔ چناں چہ انھوں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے نواب صاحب کی خدمت میں ایک عرض داشت روانہ کی جس کا آغاز کسی روشناسی کے بغیر بہ راہِ راست تخاطب کی جسارت پر اعتذار سے ہوتا ہے، لیکن اس اعتذار میں بھی انھوں نے حد درجہ حکمت و دانائی کے ساتھ ’’گوشہ نشینی‘‘ کے باوجود ’’سخن گستری‘‘ میں اپنی بلند آوازگی کے اشتہار کی گنجائش نکال لی ہے۔ لکھتے ہیں:

’’عریضہ نگار درویشِ گوشہ نشینے بیش نیست۔ اگر در سخن گستری بلند آوازہ باشد، گو باش۔ ہر آئینہ خودی سنجد کہ فرستادنِ نامہ بے آں کہ روشناسِ آستاں نشینانِ آں درگاہ شدہ باشم، جسارت خواہد بود و ایں

جسارت جز تضعیفِ خویش ثمر نہ خواہد بخشید۔ اگر مشاہدہ شاہد نہ بودے کہ بندگاں حاجتِ خود از خدامی خواہند و آں گستاخی و بے ادبی نیست، نہ توانستمے عریضہ نگاشتن و پاسخ چشم داشتن۔ بلے بندگاں ہم از خدامی خواہند و ہم از خداوند۔ سررشتۂ ردّ و قبولِ دعا و مدّعا بہ دستِ خدا و خداوند است۔"

نواب صاحب کے داعیۂ نوازش و بخشش کو حرکت میں لانے کی اس حکیمانہ کوشش کے بعد عرضِ مطلب اور حصولِ مدعا کے لیے سلسلہ جنبانی کا یہ انداز موقع شناسی اور مصلحت اندیشی کے نقطۂ نظر سے غالبؔ کے کمالِ احتیاط کی نشاں دہی کرتا ہے:

"قصیدۂ مدحیہ فرستادہ (ام) و...... ہنوز ...... نہ دانستہ ام کہ بہ نظر گاہِ خدایگاں گزشت یا خود آں عرضہ در عرضِ راہ تلف گشت ...... گفتارِ مرا بختِ قبول و مدحِ مرا ارزشِ صلہ کجاست۔ بدیں قدر التفات خشنودم کہ دبیرانِ ہمایوں دفتر توقیع بہ نام من نویسند تا از رسیدنِ آں قصیدہ و ایں عرض داشت آگہی یافتہ بر رسائیِ طالع و بلندیِ اخترِ خویش نازمی کردہ باشم۔"

امین الدولہ آغا علی خاں مہرؔ معتمد الدولہ آغا میر کے صاحب زادے تھے۔ کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ میں قیام کے دوران آغا میر کی مدح میں شعر کہہ کر غالبؔ جس انفعالی کیفیت سے دوچار ہوئے تھے، اس کا اظہار انھوں نے اس قصیدے کو اپنے خاندان کے لیے "داغِ بدنامی" قرار دے کر کیا تھا۔ اس کے باوجود محض اس حسنِ ظن کی بنا پر کہ بیٹے کا باپ کی طرح "گدا طبیعت" ہونا ضروری نہیں، انھیں امین الدولہ سے نام و پیام کی راہ ہموار کرنے میں کوئی تامّل نہیں ہوا۔ چناں چہ انھوں نے دیوانِ ریختہ کا ایک نسخہ اس امید کے ساتھ ان کی خدمت میں روانہ کیا کہ اگر اس ہدیے کی مناسب انداز میں پذیرائی ہوئی تو دیوانِ فارسی کا ایک نسخہ بھی نذر کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔ لکھتے ہیں:

"منتخبِ دیوانِ ریختہ کہ ورقے چند بیش نیست، از جانبِ خاکسار ہدیۂ آں بارگاہ است وزبانِ نیاز بدیں گونہ عذر خواہ کہ چوں از ہر دو سو دل ہارا بہ مہر گرائش ومحبت رابہ نامہ وپیام افزائش روے خواہد داد، دیوانِ فارسی نیز بہ نظر گاہِ التفات خواہد گزشت۔ حالیا غزلے ہم ازاں اوراق نگاشتہ می شود تا از سوزِ درونِ نامہ نگار خبر تواند داد۔"

غالبؔ نے کسی زمانے میں ٹیپو سلطان کے پوتے شہزادہ بشیر الدین توفیق کو اپنی بعض کتابیں بہ طورِ نذر بھیجی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد شہزادۂ موصوف نے اپنے ایک خط میں ان کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے نثر و نظمِ فارسی و اُردو کی باقی تصانیف کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور ان کی قیمت بھی دریافت کی تاکہ مطلوبہ رقم بھیج کر یہ کتابیں حاصل کی جاسکیں۔ غالبؔ نے جو موقع ومحل کی نزاکتوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے، یہ محسوس کیا کہ اگر اس اظہارِ شوق کے جواب میں حُسنِ طلب سے کام لیا جائے تو یہ تدبیر مکتوب الیہ سے کتابوں کی معمولی قیمت کے بجاے صلے کی کسی گراں قدر رقم کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ چناں چہ اس فرمائش کے جواب میں انھوں نے جو خط لکھا اس میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ حرفِ مطلب بھی بہ خوبی ادا ہو جائے اور نامہ نگار کا وقار بھی مجروح نہ ہو۔ فرماتے ہیں:

"درمعرضِ طلبِ کلپترہ ہاے فقیر حرفِ پرسشِ مقدارِ قیمت چرا برزبانِ قلم رفت؟ ہنجارِ نوازشِ نیازمندانِ بے نوا نہ این است۔ بے سرمایہ ام نہ فرومایہ، سخنورم نہ سوداگر، موئینہ پوشم نہ کتاب فروش، بزیرندۂ عطایم نہ گیرندۂ بہا، ہر چہ آزادگاں بہ شہزادگاں فرستند، نذر است وہر چہ شاہزادگاں بہ آزادگاں بخشند، تبرک۔ بیع و شریٰ نیست، چون وچرا نیست۔ ہر چہ فرستادہ ام، ارمغان است و ہر چہ خواہم فرستاد، ارمغان خواہد بود۔"

اس حسنِ تدبیر اور حسنِ طلب کے باوجود اگر صلہ وبخشش کے حصول کی کوئی کوشش حسبِ

مراد بار آور نہ ہوتی تو کبھی کبھی مرزا صاحب کی انانیت جوش میں آجاتی اور آزادگی و خود بینی کا وہ عنصر جو عموماً ایک جذبۂ خوابیدہ کی طرح ان کے نہاں خانۂ وجود میں روپوش رہتا، یک بہ یک حرکت میں آجاتا تھا۔ نواب شاہ جہاں بیگم رئیسۂ بھوپال کے شوہر نواب باقی محمد خاں نے ایک بار انھیں خط لکھ کر ان کے کلامِ نظم و نثر سے مستفیض ہونے کی خواہش اور بھوپال میں اس کے انطباع کے ارادے کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب نے پہلے ''مہرِ نیم روز'' کا ایک نسخہ اور اس کے چند روز بعد بادشاہ اور ولی عہد کی مدح کے دو تازہ مطبوعہ فارسی قصیدے بہ سبیلِ ڈاک ان کی خدمت میں روانہ کر دیے۔ ابھی وہ ''پنج آہنگ'' اور دیوانِ فارسی و دیوانِ اردو کے نسخے نواب صاحب موصوف کو بھیجنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ان کے کسی معتمد کی طرف سے انھیں ایک خط موصول ہوا جس میں کتابوں کی خریداری کی غرض سے پچاس روپے کی ہنڈی بھیجنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ چوں کہ غالبؔ کو ایک ذی وقار رئیس وقت سے کاروباری سطح کے اس سلوک کی توقع نہیں تھی، اس لیے وہ بہت جز بز ہوئے اور انھوں نے کسی تامل کے بغیر یہ پیشکش مسترد کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے مکتوب نگار کو لکھا:

> ''اکنوں کہ نواب صاحب ارمغانِ مارا ارمغاں نہ دانستند و مارا کتاب فروش پنداشتند، از عزیمت خود پشیماں گشتیم ...... بہ حیرتم کہ نواب صاحب در آغاز چہ فہمیدہ بودند و انجامِ کار حضرت را چہ در ضمیر گزشت ...... پدید آمد کہ نواب صاحب چناں کہ سخن را نہ فہمند، آدم را نیز نہ می شناسند و مارا با چنیں کسے کار نیست۔''

غالبؔ کے لیے شاعری بعض دوسرے بڑے شاعروں کی طرح محض احساسات و جذبات کے ادبی اظہار کا وسیلہ نہ تھی۔ اپنے اس دعوے کے باوجود کہ

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

وہ اسے حصولِ عزت ہی نہیں، جلبِ منفعت کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ان کا پیشہ بھی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ فارسی کے ایک قطعے میں جس کا مخاطب کوئی ایسا شخص ہے جو مال و جاہ پر مغرور ہونے کے باوجود غالبؔ سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اسے اپنا ''مخلصِ صادق الولا''

سمجھیں، انھوں نے خود بھی شاعری کے ''پیشہ'' ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ان حالات میں ان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ معاملات میں اپنے پیشے کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیں۔ چناں چہ کتابوں کا تہدیہ ہو یا قصائد کی پیش کش، ان کا کوئی عمل بے مقصد نہ ہوتا۔ وہ اسے قطعاً مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ اپنی تخلیقی صلاحیتیں کسی ایسے کام پر صرف کریں جس سے نہ دنیوی فائدہ حاصل ہو اور نہ آخرت میں کسی اجر کی امید رکھی جائے۔ اپنے اس موقف کی وضاحت انھوں نے نواب محمد سعید خاں والیِ رام پور کے چھوٹے بھائی نواب عبداللہ خاں صدر الصدورِ میرٹھ کے نام کے ایک خط میں کر دی ہے، جو قصیدے کے لیے ان کی فرمائش کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ تفصیل خود غالبؔ کی زبانی سنیے:

''خدّامِ بلند مقام کہ سرانجامِ قصیدہ بہ قصدِ نام آوری از غالبؔ بے نوا چشم داشتہ اند، مگر آں فرسودہ روانِ افسردہ دل را کہ ہنوز نہ مردہ است، زندہ پنداشتہ اند...... اگر دانند کہ فلانے با ایں ہمہ پریشانی سخن گفتن می تواند و من نیز دانم کہ می توانم، در مدحِ بندگانِ سپہر آستاں، امیر المسلمین، قبلۂ دنیا و دین، سرورِ سلطان نشاں، نواب محمد سعید خاں بہادر بالقابہ چرا سخن نہ رانم تا اگر دریں گیتی لعل و گہر سود نہ بُردہ باشم، خود دراں گیتی دین و ایماں زیاں نہ کردہ باشم۔ امید کہ دربارۂ گرائش بدیں ستائش نظماً و نثراً نامہ نگار را از اموات شمارند و بہ دعاے سلامتِ ایماں...... یاد آرند۔''

تفضّل حسین خاں کے نام کے ایک خط میں ایک قصیدۂ مدحیہ کے سلسلے میں نواب ٹونک کی بے نیازی پر انھوں نے جس سخت ردِ عمل کا اظہار کیا ہے، اس سے بھی اس سلسلے میں ان کے طرزِ فکر اور طریق کار کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''من آں می خواہم کہ چوں نواب مرا وقع نہ نہادہ ستائشم را بہ شگفتگی نہ پزیرفت، من ہم بے حوصلگی کنم و ایں قصیدہ را خط کشم و در دیواں نہ

نویسم و چوں نواب نامِ مرا در دفترِ خویش نہ پسندیدند، من نامِ نامیش را
به دیوانِ خود نہ پسندم...... ہیہات کہ خونِ جگر خوردنِ من رائگاں
رفت۔ چہ اسودائے ستائشِ ایں بزرگوارم در سر افتاد۔ نہ جائزۂ دام و
درمے کہ آں را بہائے گوہرِ سخن توانم دانست و نہ صلۂ لطف و کرمے کہ
خود را بداں شکیبا توانم کرد۔"

قدر ناشناسی کی پاداش میں اربابِ اقتدار میں سے جو لوگ غالبؔ کے عتاب کی زد میں آئے، ان میں سلطانِ عالم واجد علی شاہ بھی شامل ہیں۔ ان کا ذکر پہلی بار جواہر سنگھ جوہرؔ کے نام کے ایک خط میں آیا ہے، جو ان کی تخت نشینی کے صرف دو ماہ تیرہ دن بعد ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۴۷ء کو لکھا گیا تھا۔ غالبؔ نے واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہہ کر اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں کی معرفت ان کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ انھیں امید تھی کہ اس کا صلہ ضرور ملے گا، لیکن قبل اس کے کہ ان کے حق میں کوئی فیصلہ ہو، امجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا اور واجد علی شاہ ان کی جگہ تخت نشین ہوئے۔ یہ گویا غالبؔ کے لیے امیدوں کے طلسم کی شکست و ریخت کا پیش خیمہ تھا، کیوں کہ واجد علی شاہ اپنے والد کے برخلاف اہلِ علم کی بجائے اربابِ نشاط کے دل دادہ تھے۔ اپنے ان تاثرات کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"شاہے کہ من اور استائش گر بودم...... ناگہاں مرد۔ پسرش کہ بہ
جائے وے اورنگ نشین است، آشفتہ سر و تباہ رائے کسے است
...... جز با مطرباں نہ می گراید و خردے استوار و رائے روشن نہ دارد۔"

غالبؔ فطری طور پر امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے اور تھک کر بیٹھ جانے کے قائل نہیں تھے، اس لیے بادشاہِ وقت کے متعلق اس اظہارِ ناپسندیدگی کے باوجود انھوں نے اپنے عزیز شاگرد میر احمد حسین میکشؔ سے مشورہ کرنے کے بعد قطب الدولہ کا سہارا لیا اور ان کی وساطت سے واجد علی شاہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کرنے کی راہ نکالی۔ لیکن جب یہ کوشش بھی ناکام ہوئی تو وہ اپنی تلملاہٹ کو ضبط نہ کر سکے۔ ردِ عمل کی اس کیفیت کا اندازہ ان کی اس تحریر سے کیا جا سکتا ہے

''بادشاہ مجنون و سلطنت درہم، کار ہا تباہ..... کے قصیدہ پیشِ دیوانہ چوں بردو باوے چہ گوید کہ ایں چیست؟ گرفتم کہ ایں ہم شد و قصیدہ در نظرش آوردند و خواندن آغاز کردند، خندید و سر جنبانید و کاغذ از دستِ خوانندہ گرفت و بہ دنداں خائید و بر زمیں انداخت یا شنید و بہ کارے دیگر روے آورد و در خصوصِ مدّعاے سائل حرفے نہ زد۔ بالفرض و التسلیم پس از شنیدنِ قصیدہ ازاں جا کہ ''للجنونِ فنون'' مثلے است حکیمانہ، بہ فرستادنِ خلعتے یا بخشیدنِ ہزار اشرفی فرماں داد، فرمانش کہ می بردو خلعت کہ می فرستد و زر کہ می بخشد؟۔''

دربارِ اودھ سے حصولِ مقصد کی کوششوں کا یہ سلسلہ کئی تلخ تجربات کے بعد واجد علی شاہ کی معزولی سے دو سال قبل کامیابی سے ہم کنار ہوا جب کہ غالبؔ کے لیے اس سرکار سے ''بہ صلۂ مدح گستری پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے۔'' علاوہ بریں دو بار خلعت بھی ملا۔ یہ سرخ روئی نتیجہ تھی مجتہد العصر، سلطان العلما مولانا سید محمد کی سعی و سفارش کا، جو اس زمانے میں اودھ کی سب سے بڑی مذہبی شخصیت تھے۔ غالبؔ اور واجد علی شاہ کے تعلقات کے سلسلے میں تصویر کا یہ دوسرا رخ اردو خطوط کی وساطت سے سامنے آیا ہے، جب کہ اوّل الذکر پہلو سے متعلق تمام تر معلومات کا واحد ذریعہ فارسی خطوط ہیں۔

اربابِ اقتدار اور اہلِ ثروت کے علاوہ عالموں، ادیبوں، شاعروں اور معاشرے کی دوسری محترم شخصیتوں سے روابط کی اہمیت کو بھی غالبؔ نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس طبقے کے افراد سے تعارف اور شناسائی کا بہترین وسیلہ خود ان کا کلام اور تصانیف تھیں۔ وہ جب بھی کسی شخص کی علم دوستی یا سخن شناسی کا شہرہ سنتے یا انھیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کے کلام کا قدر دان ہے تو وہ اس سے اولین فرصت میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے۔ صاحب عالم مارہروی کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جن سے غالبؔ ارادت مندی کا تعلق رکھتے تھے۔ ان سے روابط کا ذریعہ شیخ بخش الدین مارہروی بنے تھے جو اپنے کسی کام سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ ان کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں:

"تا بہ زبانِ دل نشیں بیانِ شما شنودہ ام کہ...... جنابِ معلّی القاب صاحب عالم طال بقاوۂ، وزاد علاوۂ، ...... بہ گفتارِ غالبؔ بے نوا سرے دارند، بر طالعِ خویشتن می نازم و ہم از گفتارِ خویش بر خویش سپاسے می نہم کہ بدیں ذریعہ روشناسِ نگاہِ قبولِ مقبلے ونشاں مندِ بندگی صاحب دلے شدہ ام۔ اگر چہ دو ورق کہ طرازِ چند غزل واند رباعی داشت، از بہرِ فرستادن بہ شما فرستادہ ام لیکن دل بداں مایہ خدمت کہ مختصر بود، نیا سود۔ دیوانے من جملۂ دیواں ہائے منطبعہ پس از فراواں جستجو بہ کف آوردہ...... بہ شما می فرستم تا بہ ہر ہنگام کہ توانید، بداں آئین کہ درخور دانید، رواں دارید۔"

"قاطعِ برہان" کی اشاعت معارضۂ کلکتہ کے بعد مرزا کی زندگی کے دوسرے بڑے ہنگامے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کے منظرِ عام پر آتے ہی غالبؔ کے اپنے الفاظ میں "معتقدانِ برہانِ قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔" اس شورشِ عام کے علی الرغم جن لوگوں نے غالبؔ کی اس کوشش کو سراہا اور ان کی محنت کی داد دی، ان میں آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مخالفت کے شور میں اس صدائے تحسین نے غالبؔ کے زخموں کے لیے مرہم کا کام کیا۔ چناں چہ ان کے خط کے جواب میں انھوں نے اس قدر افزائی پر مسرّت آمیز استعجاب کے ساتھ اس طرح اظہارِ تشکر کیا ہے:

"آغائے نام آور کہ سخن در ستائشِ ایں تا ہوکشِ یا ہو سرائے سرودہ است، ہمانا خود را از روئے انصاف بہ شیوۂ حسنہ نوازی و در ویش ستائی ستودہ است۔ یاد آوری را قدر دانی آں گاہ پنداشتہ باشم کہ بر خود گمانِ کمالے داشتہ باشم۔ ازاں جا کہ از عز و جاہ بہرہ واز علم و ہنر نشاں نہ دارم، ہر آئینہ ازان نہ گریزم کہ سپاسِ قدر افزائی بجا آرم۔ نگارشِ خولجہ در بارۂ نکوئی قاطع برہان نامہ نگار را بہ شگفت زار افگند،

چہ ایں سوادنا مقبولِ طبائع دانش مندانِ ہند افتادہ است، دعویٰ مرا مسلّم نہ می دارند و گفتارِ مرا نہ می پسندند۔"

غالبؔ کو اپنے مخصوص حالات کی بنا پر ملک کے مختلف شہروں کو ایک باشعور مبصر کی نظر سے دیکھنے، وہاں کے لوگوں کے عادات واطوار کو سمجھنے اور ان کے طرزِ بود و ماند کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بہترین مواقع ملے۔ ان شہروں اور ان کے باشندوں کے بارے میں ان کے تاثرات بھی تاریخی اور معاشرتی زاویۂ نگاہ سے غالبؔ کے دور کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر چہ بعض اوقات ان تاثرات میں مشاہدے کی معروضیت پر جذبات کی شدت غالب آگئی ہے، تاہم ان کو محض سرسری بیانات قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے پہلوؤں سے غرض نہ رکھی جائے تب بھی کم سے کم سیر و سیاحت اور مردم شناسی کے معاملے میں غالبؔ کے ذاتی تجربات اور مختلف حالات میں ان کے جذباتی ردِ عمل سے آگاہی کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان شہروں میں بنارس سرِ فہرست ہے، جس کے متعلق انھوں نے اپنے فارسی خطوط میں نہایت تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ علاوہ بریں فارسی ہی میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو "چراغِ دیر" کے نام سے ان کے کلیات کی زینت ہے۔ اُردو کے کئی خطوط میں بھی اس شہر کے حوالے موجود ہیں۔ اس اعتبار سے اسے مستقل مطالعے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ کلکتے کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ مرزا غالبؔ کے ذہنی افق کو نئی وسعتوں سے آشنا کرنے میں اس شہر کا بڑا دخل ہے۔ دہلی تیسرا شہر ہے جسے غالبؔ کے جغرافیۂ وجود میں کئی اعتبار سے اہم ترین مقام حاصل ہے۔ غالبؔ کے نقطۂ نظر سے اس شہر کی زندگی کے سماجی و معاشرتی پہلوؤں کا جائزہ صحیح معنی میں ان کے اردو خطوط کی روشنی میں لیا جا سکتا ہے۔ فارسی خطوط میں انھوں نے اس موضوع پر بہت کم اظہارِ خیال کیا ہے۔

کلکتے سے واپسی کے قریبی زمانے کے بعض خطوط میں انھوں نے دہلی اور دہلی والوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ زیادہ خوش آیند نہیں۔ مثلاً کلکتے سے دہلی پہنچنے کے بعد مولوی سراج الدین احمد کے نام لکھے گئے پہلے ہی خط میں انھوں نے اس شہر کے لوگوں کے بارے میں اپنے تلخ تجربے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"درعرضِ ایں سہ سال کہ مرا بہ بیروں گردی وصحرانوردی گزشت، رسم
دراہِ اعیانِ دہلی برگشتہ ومہر ووفا درنہادِ یاراں نہ ماندہ...... گراں
مایگان وصاحب دلاں درزوایائے خمول فرورفتہ وسفلگان وسفیہاں را
روزگار بہ روئے کارآوردہ۔"

اسی زمانے کے ایک اور خط میں مرزا احمد بیگ طپاںؔ کو لکھتے ہیں:

"دہلی شائستگیِ آں نہ دارد کہ آزادۂ دروئے خاک نشیں تواند بود۔
خاص وعامِ ایں بقعہ بے سبب آزار ومرد وزنِ ایں تیرہ بوم مردم
خوار......"

کلکتے کے زمانۂ قیام میں مرزا احمد بیگ طپاںؔ کے نام لکھے گئے ایک خط میں دہلی کی بعض رسوم کا ذکر بھی دل چسپی کے ساتھ پڑھے جانے کی چیز ہے۔ ختنہ اور مکتب نشینی کی تقاریب سے متعلق یہ بیان اس دور کی معاشرتی زندگی کے ایک خاص پہلو پر معلومات افزا تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے:

"درشہرِ خویش چنیں نہ دیدہ ام کہ در شادیِ بسم اللہ در محافل ومجالس بہ
دستِ طفل چیزے دہند۔ آرے بہ تقریب ختنہ ایں چنیں بہ عمل می
آید، لیکن در شادیِ مکتب نشینی دو رسم در دیارِ خویشتن دیدہ ام۔ یکے آں
کہ ملاّئے کہ طفل را مسوّدۂ اقرا باسمِ ربک بہ خواندن می دہد، اعمام و
اخوانِ طفل چیزے بہ وے می دہند۔ دوم ایں کہ خوان ہائے میوہ یا نقد
بہ طریق شگونِ تہنیت می فرستند۔"

سطورِ بالا میں پیش کردہ پہلے دو اقتباسات میں غالبؔ نے دہلی والوں کے خلاف جس غم وغصہ کا اظہار کیا ہے، وہ پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں ان کی تگ ودو کی بے حاصلی اور اس معاملے میں دہلی کے بعض بااثر لوگوں کی ریشہ دوانیوں کا وقتی ردِ عمل تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ اس خط کے ذریعے سامنے آتا ہے جو سنہ ۱۸۵۷ء کی "رستخیزِ بے جا" کی تباہ کاریوں کے بعد سلطان زادہ

بشیر الدین میسوری کو لکھا گیا تھا۔ اس ہنگامے نے انھیں "ہزاروں کا ماتم دار" بنا دیا تھا۔ اردو کے متعدد خطوط کی طرح فارسی کا یہ خط بھی اس سلسلے میں ان کے دردِ دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"شست وشش مرحلہ از مسیرِ عمر سبک سیر پیمودہ آمد۔ پنجاہ سال ہنگامۂ مہر ورزی وعشق بازی بانکو محضرانِ دہلی گرم داشتہ آمد تا دریں مدت چہ مایہ دوستانِ یک دل فراہم آمدہ باشند۔ ناگاہ چرخِ تیز گرد آں پیوند ہائے روحانی را بداں ساں برید کہ خوں از رگِ جاں فرو چکید۔ ازاں بے مر عزیزاں کہ ہمہ را نیارم شمرد، دریں تیر بارانِ حوادث و ناسزا کار زار نہ ماندند مگر خستۂ چند، اینک من و بہ داغِ کشتگاں نژند زیستن و برحالِ خستگاں خوں گریستن۔ خستہ و بہرہ ور ماتم دارِ شہر و اہلِ شہر۔"

غالبؔ آگرے میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کا بچپن جوانی کے حدود میں داخل ہوا۔ لیکن شادی کے بعد جب دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوئے تو پھر انھیں دوبارہ آگرے جانا نصیب نہ ہوا، اس کے باوجود کسی شخص کو اپنے وطن یا مولد و منشا کے ساتھ جو محبت ہو سکتی ہے وہ ان کے دل میں ہمیشہ موجود رہی۔ اس کا اندازہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھیں اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب وہ بہ غرضِ تفریح یا کسی ذاتی کام کے سلسلے میں آگرے گئے ہوئے تھے۔ اس خط میں غالبؔ نے یادوں کے سیلِ رواں کو وفورِ شوق اور شدتِ جذبات کی تمام کیفیات کے ساتھ جس طرح الفاظ کی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے، اسے ان کے جادو نگار قلم کی مرقع آفرینی کا ایک نادر نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"گرفتم کہ خود را بہ سفر گرفتہ و نزدیکِ خود از من دور تر رفتہ اید، امّا چوں ہنوزم در وطنید، ہمانا کہ نزدیک بامنید۔ شادم کہ شوقِ دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستاد تا ہم دریں غربت دادِ شادمانیِ دیدارِ وطن نیز توانم داد۔ زینہار اکبر آباد را بہ چشمِ کم نہ نگرند و از رہگزر ہائے آں دیار الحفیظ گوے و الاماں سرائے گزرند کہ آں آباد چہ ویران و آں

ویرانہ آباد بازی گاہِ ہم چوں منِ مجنونے و ہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمۂ خونے است۔ روزگارے بود کہ دراں سرزمیں جز مہر گیانہ رستے و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیمِ صبح دراں گل کدہ بہ مستانہ وزیدن دل ہا را آں مایہ از جا برانگیختے کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سرو پارسایاں را نیتِ نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرّۂ خاکِ آں گل زمیں را از تن پیاے بود دل نشیں و ہر برگِ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشاں، امّا تازگی وقتِ شمار در نظر داشتہ درد و پردہ پرسش انگیختہ بود و چشم بہ راہِ آں داشت کہ کے نویسند و دریغ کہ ہیچ گاہ نہ نوشتند کہ رَشحِ سنگیں دعائے مرا بہ کدام ادا پزیرفت و دریا بہ پاسخ سلامِ من بہ زبانِ موج چہ گفت؟''

بنارس، کلکتہ، دہلی اور آگرے کے بعد الہ آباد پانچواں اور آخری شہر ہے جس کا ذکر غالب کے فارسی خطوط میں ان لوازم کے ساتھ ملتا ہے جو کسی بستی کی تہذیبی و معاشرتی شناخت میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ باندے سے کلکتے جاتے وقت ان کا ارادہ تھا کہ الہ آباد میں کچھ دنوں قیام کر کے اپنے امراض کی رعایت سے ضروری دوائیں اور موسم کی مناسبت سے کچھ کپڑے اور دوسرا سامان فراہم کرنے کے بعد آگے بڑھیں گے، لیکن الہ آباد پہنچ کر انھیں اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ بادلِ ناخواستہ صرف ایک رات اور ایک دن وہاں قیام کرنے کے بعد وہ بنارس کی طرف چل پڑے۔ ارادے کی اس تبدیلی کے اسباب خود انھی کی زبانی سنیے:

''آہ از الہ آباد و لعنتِ خدا براں خرابہ باد کہ نہ دروے دوائے درخورِ بیمار و نہ متاعے شائستۂ مردم۔ (شرم و حیا در) مرد و زنش ناپیدا و مہر و آزرم از طبع پیر و جوانش گم...... چہ ناانصافی است ایں وادیِ ہولناک را شہر نامیدن و چہ بے حیائی است آدم زاد را دریں دام گاہِ غول آرا میدن...... بہ خدا کہ اگر بازگشت از کلکتہ منحصر در راہِ الہ آباد باشد، بہ

ترکِ وطن گویم و راہِ معاودت نہ پویم۔"

مرزا کے ان فارسی خطوط کے مطالعے سے ان کے عہد کی معاشرت کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ آج کی طرح اس دور میں بھی سفارشات کا چلن عام تھا۔ لوگ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے نہ تو بارسوخ حضرات کا تعاون حاصل کرنے میں کسی احتیاط یا تکلف سے کام لیتے تھے اور نہ معاشرے کے ان مقتدر افراد کو اپنے اثرات کے استعمال میں تامل ہوتا تھا۔ غالبؔ جس زمانے میں اپنے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں کلکتے میں مقیم تھے اور ان کی درخواست محکمہ جاتی رپورٹ کے لیے مسٹر کول بروک، ریزیڈینٹ دہلی کے پاس پہنچی ہوئی تھی، کار براری کے لیے مناسب سفارشات کے حصول میں پوری طرح سرگرم نظر آتے ہیں۔ محمد علی خاں کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امرائے کلکتہ میں سے ایک امیر کی عنایت و نوازش سے اس سلسلے میں "صاحبانِ عالی شان" میں سے کسی "صاحب" کا سفارشی خط حاصل کر کے مسٹر کول بروک کے نام اور نواب علی اکبر خاں طباطبائی کا خط ان کے منشی التفات حُسین خاں کے نام دہلی بھجوا چکے تھے اور خود مولوی صاحب موصوف سے اس امر کے خواہش مند تھے کہ اگر التفات حسین خاں سے ان کے تعلقات ہوں تو وہ بھی انھیں خط لکھیں ورنہ حکیم سلامت علی خاں سے سفارشی خط حاصل کر کے اسے غالبؔ کے وکیل پنڈت ہیرالال کے پاس دہلی بھیج دیں۔

پیروی و کارسازی اور سعی و سفارش کا یہ عمل ایسا نہ تھا جسے غالبؔ ایک عام اہلِ غرض کی طرح صرف اپنے لیے جائز و مستحسن سمجھتے ہوں۔ وہ خود بھی حتی الامکان اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مشکلات میں ان کے کام آنے اور تا بہ مقدور ان کی مدد کرنے میں کوتاہی سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان کے متعدد خطوط اس معاملے میں ان کی مستعدی اور فراخ دلی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ چناں چہ ایک بار جب کہ مولوی سراج الدین احمد، غالباً گورنر جنرل کے دورۂ شمالی ہند کے سلسلے میں، الہ آباد میں مقیم تھے اور وہاں حکیم غلام نجف خاں کے چھوٹے بھائی حمید الدین خاں کا کوئی مقدمہ پیش ہونا تھا، غالبؔ نے موخر الذکر کی سفارش میں مولوی صاحب موصوف کو جو خط لکھا ہے اس سے دوستوں کے معاملات و مسائل میں ان کی اس غیر معمولی دل چسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"والا گہر جناب محمد حمید الدین خاں صاحب کہ بہ خدمت می رسند و

نامۂ من می رسانند، اگر بہ جاے من شمردہ شوند، جا دارد...... ہمیں برادرِ ایشاں جناب محمد نجف صاحب کہ...... با من در مہرِ دل بازباں یکے دارند و دریں افسردگی کہ من دارم، اگر مرا نشاطے و انبساطے ہست، بہ دیدارِ ایشان است، چوں با من از رفتنِ برادرِ خود بہ الہ آباد و منشاے خصومتِ اعدا سخن کردند، پیش ازاں کہ از جانبِ شاں خواہش رود، مرا خود در دل افتادہ کہ با شما عہدِ وفا تازہ کُنم و ہر گونہ تفقد و التفاتے کہ دریں مایہ مدت بہ گنجینۂ ضمیرِ مخدوم خاصہ از بہرِ من فراہم شدہ و مرا ہم فہرستے در خیال ترتیب یافتہ، ہمہ از بہرِ ایں بزرگوارِ والا تبار در خواہم۔ دردِ دل شنودن و بہ چارہ رہ نمودن و اندوہِ تنہائی از دل بردن و کارِ ایشاں را کارِ من دانستن و جُز ایں ہا از لطف و کرم انچہ در حوصلۂ وقت گنجد، بہ کار می تواں برد۔''

مقدمات و معاملات کے تصفیے کے علاوہ ملازمت کے حصول اور ضرورت مندوں کے ساتھ مالی تعاون کے سلسلے میں بھی سفارشات ایک کارگر ذریعے اور موثر وسیلے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ میجر جان جیکب کے نام غالب کا ایک خط جس میں انھوں نے اپنے ایک شناسا لالہ ہیرا لال کی سفارش کی ہے، اس صورتِ حال کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''رسانندۂ ایں نامہ لالہ ہیرا لال از شرفاے ایں دیار و خوبانِ روزگار ند۔ عمرے بہ رفاقتِ حکیم کاظم علی خاں بسر بردہ۔ زاں پس بہ مقتضاے حب الوطن بہ دہلی رسیدہ اند۔ از بے دست گاہی فرو ماندہ، فرجامِ کارِ خوش و ناخوش خود را بہ گوالیار رسانندہ اند۔ خطِ خوانا دارند و آئینِ کتابت دانند۔ اگر بہ کار آیند، ایشاں را زدِ خود نگہ دارند و کارِ کتابت از ایشاں گیرند نیز اگر امکان گنجائی داشتہ باشد، در زمرۂ متصدیاں بہ سرکارِ کرنیل صاحب والا مناقب یا بہ سرکارِ جاہ مندے

دیگر جادہ ہندو برنامہ نگار سپاس نہند۔ اگر ایں ہر دو صورت ظہور نہ گیرد،
ایشاں را بہ عطاے زادِ راحلہ بنوازند و کارِ ایشاں بداں گونہ سازند کہ از
گوالیار تا بڑودہ توانند رفت و آقاے قدیمِ خود را توانند دید۔ ہمانا ایں
ہر سہ صورت کہ گفتہ آمد، ناممکن و دشوار نیست و نوکری یک متصدّی در
گوالیار و رفتنِ یک مسکین تا بڑودہ آں قدر ہا کار نیست کہ در گزارش
تکلف کنم و خود را از سپارش نگاہ دارم۔"

غالبؔ کے ان خطوط کی اہمیت کا ایک قابلِ ذکر اور توجہ طلب پہلو ان کا بین اللسانی کردار بھی ہے۔ چناں چہ ان میں سے بعض خط انھی مکتوب الیہم کے نام کے اردو خطوں کے ساتھ مل کر کبھی کبھی کسی نامکمل سلسلۂ واقعات کی تکمیل یا منتشر اجزاے بیان کی ترتیب و تنظیم میں قارئین و محققین کی مدد کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری کو اپنا معمول بنا لینے کے بعد بھی غالبؔ اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کو بہ طورِ تفنّنِ طبع گاہ بہ گاہ فارسی میں بھی خط لکھ دیا کرتے تھے۔ وسیلۂ اظہار کی اس تبدیلی کے باعث کبھی کبھی اس فارسی خط سے معاً پہلے اور بعد کے دو اردو خطوں کے درمیان ایک قسم کے خلا کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج کے حالات میں جب کہ اردو کے تمام خطوط تاریخی ترتیب سے مجموعوں کی صورت میں مرتب ہو چکے ہیں، ایک باشعور قاری کو اس خلا کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ درمیانی خط کو غائب شدہ تصور کر کے اس سے صرفِ نظر کر لیتا ہے اور اس کی معلومات ناقص رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر تفتہؔ کے نام ۲۲؍مارچ سنہ ۱۸۵۲ء کو ایک خط اردو میں اور ۲۴؍مارچ سنہ ۱۸۵۲ء کو دوسرا خط فارسی میں لکھا گیا تھا۔ یہ دونوں خط جو زبان، لغت اور اصلاحِ شعر کے بعض مسائل سے متعلق ہیں، اردو اور فارسی خطوط کے دو مختلف مجموعوں میں محفوظ ہیں۔ اگر قاری فارسی کے اس خط کے وجود سے بے خبر ہے یا فارسی ہی سے ناواقف ہے تو وہ ان مسائل سے متعلق غالبؔ کے موقف کو پوری طرح سمجھنے میں قاصر رہے گا۔ اسی قسم کی ایک اور مثال منشی شیو نرائن آرامؔ کے نام کے خطوط سے پیش کی جا سکتی ہے۔ اردو کے ایک مجموعے میں ان کو لکھے گئے خطوں میں سے چھبیس خط محفوظ ہیں۔ اس کے برخلاف فارسی کے کسی مجموعے میں ان کے نام کا کوئی خط موجود نہیں۔ البتہ اردو کے تیسرے خط

مورخہ ۳۱ اگست سنہ ۱۸۵۸ء کا یہ اندراج کہ "مرزا تفتہ نے مجھے پارسل کی رسید نہیں لکھی۔ اب میرا خطِ فارسی اپنے نام کا اور یہ خط، دونوں خط ان کو دکھا دیجیے۔" اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس سے دو چار روز قبل ان کے نام فارسی میں ایک خط لکھا جا چکا تھا۔ راقم السطور نے اس اشارے کی بنیاد پر تلاش شروع کی تو "باغِ دودر" میں مرزا تفتہ کے نام کے خطوط میں یہ خط دستیاب ہو گیا۔ غالباً ہوا یہ کہ غالب کے حسبِ ہدایت یہ خط مرزا تفتہ کے ملاحظے کے لیے ان کے پاس بھیج دیا گیا اور انھوں نے اسے پڑھنے کے بعد مکتوب الیہ کو واپس کرنے کی بجائے بہ حفاظت اپنے کاغذات میں رکھ لیا۔ بعد ازاں "باغِ دودر" کی ترتیب کے وقت یہ ان کے نام کے باقی دس خطوں کے ساتھ مل کر اس مجموعے کا حصہ بن گیا۔ یہ خط جو اردو کے مذکور الصدر خط سے صرف دو دن قبل ۲۹ اگست سنہ ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا تھا، "دستنبو" کی اشاعت سے متعلق ہے اور اس بارۂ خاص میں اردو کے خط نمبر ۱ کو خط نمبر ۳ سے مربوط کرتا ہے۔ تفتہ کے نام اردو کے ایک مکتوب مورخہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۵۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام کو یہ خط ان کے مشورے کے مطابق لکھا گیا تھا۔

غالب کے مکتوب الیہم میں کئی ایسے لوگ شامل ہیں جن کے نام کے خطوط وافر تعداد میں دستیاب ہیں، لیکن ان میں سے صرف ایک خط فارسی میں ہے باقی تمام خط اردو میں لکھے گئے ہیں۔ منشی نبی بخش حقیر، قاضی عبدالجمیل جنوں، میر مہدی مجروح، منشی شیونرائن آرام، منشی حبیب اللہ ذکا اور میر غلام بابا خاں جیسے مخصوصین اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں سے منشی شیونرائن آرام اور میر غلام بابا خاں کے علاوہ باقی چاروں اشخاص سے مراسلت کا آغاز فارسی میں ہوا اور یہ اس زمانے میں ہوا جب کہ مرزا صاحب عموماً اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔ حقیر کے نام یہ پہلا خط ۲۲ فروری سنہ ۱۸۴۸ء کو، قاضی عبدالجمیل جنوں کے نام ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۴۹ء کو، میر مہدی مجروح کے نام اندازاً فروری سنہ ۱۸۵۳ء میں اور منشی حبیب اللہ ذکا کے نام ۱۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کو لکھا گیا تھا۔ غالب کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھ کر ان خطوط کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ اپنے مخاطبین کے ذہنوں پر معاصرین کے مقابلے میں اپنی لسانی برتری کا نقش بٹھانے کے لیے وقتاً فوقتاً نظم کی طرح نثر میں بھی بالقصد مگر بالواسطہ "فارسی بیں تا بینی نقش ہائے رنگ رنگ" کا نعرہ بلند کرتے رہتے تھے۔

غالب کے ان خطوط کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض کی مخاطب وہ

گرامی قدر و عالی مرتبت ہستیاں ہیں جنھوں نے مکتوب نگار کی شخصیت پر اپنی محبت و دل نوازی اور کرم گستری و کارسازی کے بڑے گہرے اور لافانی نقوش چھوڑے ہیں اور جن کے نام انھوں نے کبھی اردو میں خط نہیں لکھا۔ شیخ امام بخش ناسخ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، حسام الدین حیدر خاں، مرزا علی بخش خاں، رائے چھج مل، مولوی محمد علی خاں، صدر امینِ باندا، مرزا احمد بیگ خاں طپاںؔ، نواب علی اکبر خاں طباطبائی، مرزا ابوالقاسم خاں اور مولوی سراج الدین احمد اس زمرے کے نمایاں افراد میں شامل ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ بھی اس استثنا کے باوجود کہ ان کے نام اردو کا ایک خط موجود ہے، بجا طور پر منتخب دوستوں اور کرم فرماؤں کی اس انتہائی مختصر فہرست میں شمولیت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی عنایتوں کے طفیل مرزا صاحب نے زندگی کے کئی معرکے سر کیے اور جن کی رفاقتوں کے نقش ان کے جریدۂ حیات پر جا بہ جا ثبت ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ مرزا صاحب کے ربط و تعلق کا منظر نامہ بنیادی طور پر ان کے فارسی خطوط ہی کی مدد سے تیار ہوا ہے۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ غالبؔ کے یہ فارسی خطوط جو اپنے ان متنوع پہلوؤں اور گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ہماری ادبی تاریخ کا نہایت بیش قیمت سرمایہ ہیں، ابھی تک ثقہ اور علم دوست غالب شناسوں کی توجہ سے محروم ہیں۔ بازار میں اور کتب خانوں میں ان کے جو نئے اور پرانے مجموعے دستیاب ہیں، ان میں سے بیشتر اپنے سقیم اور مجروح متن کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ ان سے پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ استفادہ کیا جا سکے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے مختلف مجموعوں، کتابوں، رسالوں اور بیاضوں میں بکھرے ہوئے ان خطوط کو سلیقے کے ساتھ یکجا کیا جائے اور جدید اصولِ تدوین کے مطابق حواشی اور تصریحات و تعلیقات کے ساتھ مرتب کر کے کم از کم دو جلدوں میں شائع کر دیا جائے۔ بعد ازاں مستعد اور فرض شناس اہلِ علم ان کے ترجمے کی طرف توجہ فرمائیں تا کہ وہ لوگ بھی ان سے حسبِ ضرورت استفادہ کر سکیں جو فارسی سے یکسر نابلد ہیں یا جن کے لیے غالبؔ و صہبائیؔ کے عہد کی فارسی تقویمِ پارینہ بن چکی ہے۔

(نیا دور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۹۹ء/ نظام اردو خطبات ۲۰۰۸ء، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

نامہ ہاے فارسیِ غالب

''نامہ ہاے فارسی غالب'' مرزا غالب کے اکتیس فارسی خطوط اور پانچ متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک بیاض پر مبنی ہے جو ۱۹۶۰ء میں سید محمد رفیع ساکن کٹرا مانک پور، ضلع الٰہ آباد سے نیشنل آرکایوز آف انڈیا کے لیے خریدی گئی تھی۔ قرائنِ ظاہری کے مطابق اس بیاض میں یہ تمام تحریریں ۱۸۳۹ء کے آس پاس یعنی کلکتے کے سفر سے غالبؔ کی واپسی کے صرف دس سال بعد نقل کی گئی تھیں۔ ان تحریروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کے سلسلے میں بعض نئے انکشافات ہوئے اور مقدمۂ پنشن نیز معرکۂ کلکتہ سے متعلق متعدد ایسے پہلو سامنے آئے جو اس سے قبل غالب شناسوں کی نگاہ سے مخفی تھے۔ بیاض کی اس اہمیت کے پیشِ نظر نیشنل آرکایوز کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سید اکبر علی ترمذی نے قاضی عبدالودود سے اس کی تدوین کی درخواست کی اور وہ بہ خوشی اس کے لیے آمادہ بھی ہو گئے۔ چنانچہ آغازِ کار کے طور پر انھوں نے اپنے رسالے ''تحقیق'' کے ۱۹۶۱ء کے شمارے میں ''مکتوباتِ غالب'' کے زیرِ عنوان ان میں سے سات خطوط اس مختصر نوٹ کے ساتھ شائع بھی کر دیے کہ ''مکتوباتِ غالب کے بیشتر خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ خطوط باقساط شائع ہوں گے اور آخری قسط کے ساتھ مقدمہ و حواشی ہوں گے۔'' اس کے علاوہ ''غالبؔ کے فارسی خطوط، ایک نیا مجموعہ'' اور ''مجموعۂ نئی دہلی اور غالب'' کے عنوان سے دو مضامین بھی تحریر

فرمائے جو بالترتیب ماہ نامہ ''ماہِ نو'' کراچی، شمارہ فروری ۱۹۶۵ء، اور سہ ماہی ''اردو'' کراچی کے ''غالب نمبر''، شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئے۔ لیکن اصل کام آگے نہ بڑھ سکا حتیٰ کہ غالبؔ کی صد سالہ یادگاری تقریبات کا زمانہ (۱۹۶۹ء) قریب آ گیا اور قاضی صاحب اس مجموعے کو آٹھ برس تک اپنے پاس رکھنے کے بعد بہ لطائف الحیل اپنی ذمہ داری ترمذی صاحب کے سپرد کر کے اس کام سے دست بردار ہو گئے۔ ترمذی صاحب نے نہایت برق رفتاری سے ساڑھے چار مہینے سے بھی کم مدت (اکتوبر ۱۹۶۸ء تا ۱۴ فروری ۱۹۶۹ء) میں متن کی ترتیب و تدوین کا یہ مرحلۂ دشوار سر کر لیا بلکہ انگریزی میں ایک طویل و بسیط مقدمہ بھی تحریر فرما دیا اور اس کارنامے کی انجام دہی پر قاضی صاحب سے داد کے مستحق قرار پائے کہ صاحبِ موصوف نے خطوط کی تاریخ وار ترتیب، متن کے تعین اور متذکرہ اشخاص و مقامات کی نشان دہی میں خاصے تعمقِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح فروری ۱۹۶۹ء میں غالب اکیڈمی، نئی دہلی کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت ''نامہ ہائے فارسیِ غالب'' اور ''پرشین لیٹرز آف غالب'' کے دوہرے نام سے یہ جلد شائع ہو گئی۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا، ترمذی صاحب نے اس مجموعے کی ترتیب و تدوین پر جتنا وقت صرف فرمایا، اس کی مجموعی مدت ساڑھے چار ماہ سے بھی کم تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنے مختصر عرصے میں کسی ایسے متن کو جس کے ہر ورق کا ایک مخصوص حصہ ناقص بھی ہے، سلیقے کے ساتھ مرتب کر دینا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ شائع شدہ مجموعے کے تقریباً ہر صفحے پر اس عجلت کاری کے اثرات نمایاں ہیں۔ واقعہ یہ ہے ترمذی صاحب تحقیق و تدوین کے مردِ میداں نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کی تمام تر تحسین و توصیف کے باوجود متن کے تعین اور اس سے متعلق امور کے تصفیے میں وہ ان دشوار گذار مراحل سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکے جن کے لیے صاحب نظری اور تجربہ کاری دونوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ آئندہ سطور میں اسی پس منظر میں اس مجموعے کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

پیشِ نظر اکتیس خطوط میں سے صرف ایک خط کے سرنامے میں اس کے مکتوب الیہ نواب علی اکبر خاں طباطبائی کا نام واضح طور پر مذکور ہے۔ باقی خطوں میں سے کسی بھی خط کے آغاز میں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس کا مکتوب الیہ کون ہے۔ البتہ ان چھے خطوط کے بارے میں جو اس مجموعے اور ''پنج آہنگ'' میں کلی طور پر مشترک ہیں، ''پنج آہنگ'' کے

حوالے سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کے مکتوب الیہ مولوی محمد علی خاں صدر امینِ باندا ہیں۔ان مشترک خطوط کے علاوہ مزید اٹھارہ خطوں کے بارے میں فاضل مرتب داخلی شہادتوں کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ یہ بھی مولوی محمد علی خاں ہی کے نام ہیں۔ چوں کہ باقی چھے خطوں (مکتوب نمبر ۲۵ تا ۳۰) کے متعلق ان کے مندرجات کی روشنی میں وہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکے، اس لیے انھیں ایک علیحدہ عنوان ''بنامِ مرد: مانِ نامعین'' کے تحت جگہ دی گئی ہے۔ان خطوط کے سلسلے میں ہمارے مشاہدات حسب ذیل ہیں:

مکتوب نمبر ۲۵: غالب قیامِ باندا کے دوران نواب ذوالفقار الدولہ کے مہمان رہے تھے۔ یہ خط جس وقت لکھا گیا ہے، نواب صاحب کسی سفر پر روانہ ہو چکے تھے اور غالب اس سے مخالف سمت میں کلکتے کے لیے پا بہ رکاب تھے۔ ان حالات میں مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ بار برداری وغیرہ کے سلسلے میں مکتوب نگار کی اعانت فرمائیں اور ''بندگانِ درِ دولت'' میں سے کسی شخص کے ذریعے شحنۂ شہر کو یہ پیغام بھجوادیں کہ وہ بنارس تک ورنہ الہ آباد تک کشتی کا انتظام کرادے۔ باندے میں غالب کے ملنے والوں میں نواب صاحب کے بعد صرف مولوی محمد علی خاں ہی ایسی بااثر شخصیت تھے جس کا پاس ولحاظ شحنۂ شہر بھی رکھتا ہو۔اس لیے یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس خط میں وہی غالب کے مخاطب ہیں۔

مکتوبات نمبر ۲۶ و ۲۷: چھبیسویں خط میں مکتوب الیہ سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ کلکتے بھیجنے کے لیے ایک خط روانہ کیا جارہا ہے، اپنے کسی ملازم کو ڈاک خانے بھیج کرا سے پوسٹ کرادیں۔ خط نمبر ستائیس میں بھی اسی طرح ایک خط ڈاک خانے بھجوانے کی استدعا کی گئی ہے۔ پہلے خط کی ابتدا ''حضرت قبلہ گاہی مدظلہ العالی سے اور دوسرے خط کا آغاز ''قبلہ گاہا، بے کساں پناہا'' سے ہوا ہے۔ چوں کہ گذشتہ خطوط میں سے نوخطوں میں مولوی محمد علی کے لیے ''حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی'' کے القاب استعمال ہوئے ہیں اور ایک خط میں انھیں ''قبلہ گاہا، بے کساں پناہا'' کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک یہ دونوں خط بھی انھی کے نام ہیں۔ علاوہ بریں خود غالب ہی کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپسی کے سفر کے دوران کلکتے اور دہلی سے ان کے نام ڈاک کی آمد کا وسیلہ مولوی صاحب ہی کی ذات تھی۔ اس سے بھی ہمارے اس قیاس کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ یہ خطوط انھی کے ذریعے ڈاک خانے بھجوائے

گئے ہوں گے۔

مکتوب نمبر ۲۸: اس خط کا آغاز ''اعلیٰ حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبۂ کونین، مدظلہ، العالی'' سے ہوتا ہے۔ اس میں مکتوب الیہ کو اپنے بہ خیریت باندا پہنچنے کی اطلاع دی گئی ہے اور ان کی بے کس نوازی و دل جوئی کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ان اندراجات سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب نواب علی اکبر خاں طباطبائی ہیں جنھوں نے غالبؔ کو ان کے قیام کلکتہ کے دوران اپنے حسنِ سلوک کا گرویدہ بنالیا تھا اور یہ غالباً وہی خط ہے جس کے ڈاک خانے بھجوانے کا ذکر خط نمبر ۲۷ میں کیا گیا ہے۔ خط کے دیگر مندرجات سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

مکتوب نمبر ۲۹: کلکتے کے سفر سے دہلی واپس پہنچنے کے پندرھویں روز ۱۵ر جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ کو لکھے ہوئے اس خط کی ابتدا ''جوہرِ جانِ گرامی فدائے خاک پائے حضرت ولی نعمی باد، مدظلہ العالی'' سے ہوئی ہے۔ مکتوب نمبر ۲۴ میں غالبؔ نے کلکتے سے روانگی سے دو چار دن پہلے محمد علی خاں کو یہ اطلاع دی تھی کہ ''در عرصۂ دو ماہ بہ باندا می رسم و جاں بہ خاکِ پائے قبلہ گاہی بر می افشانم۔'' زیرِ بحث خط کے شروع میں بھی مکتوب الیہ کی خاکِ پا پر جاں افشانی کی خواہش کے اظہار سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ دونوں خط ایک ہی مکتوب الیہ کے نام ہیں۔ اس قیاس کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اس خط میں غالبؔ نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی بیماری کی تشویش ناک صورتِ حال کا بھی کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے، جب کہ مکتوب نمبر ۶ میں مولوی صاحب کو ان کی علالت میں غیر متوقع افاقے کی خوش خبری سنا چکے تھے۔ مقدمۂ پنشن سے متعلق بعض معاملات کا ذکر بھی اسی طرف رہبری کرتا ہے۔

مکتوب نمبر ۳۰: اس خط کا سرنامہ ''حضرت قبلہ گاہی، ولی نعمی، مدظلہ، العالی'' کو بنایا گیا ہے۔ یہ القاب مولوی محمد علی خاں کے لیے مخصوص ہیں۔ چنانچہ اس مجموعے کے دس خطوط کی ابتدا اسی سرنامے سے ہوئی ہے۔ خط کی ابتدائی سطور میں ''جاں بہ خاکِ آں کفِ پا می فشانم'' جیسا والہانہ اظہارِ عقیدت بھی اسی ذیل میں آتا ہے اور اس خط کو خطوط نمبر ۲۴، ۲۹ سے مربوط کرتا ہے۔ خط نمبر ۲۹ میں مکتوب الیہ کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ''قصیدہ بہ خدمتِ مسٹر فرانس (ہاکنس صاحب) گزشت و مطبوعِ طبعِ نکتہ دانش گشت۔'' اس خط کے آخر میں یہ قصیدہ بھی اس تمہیدی جملے کے ساتھ کہ ''قصیدہ کہ در مدحِ خدامِ ناظم الملک مسٹر فرانس ہاکنس بہادر، ہیبت جنگ از رگِ کلک

فرو ریختہ است، رقم می گردد"، نقل کر دیا گیا ہے جو ان دونوں خطوط کے باہمی ربط پر دلالت کرتا ہے۔

سطورِ بالا میں پیش کردہ تفصیلات کی روشنی میں "مردمانِ نامعین" سے منسوب چھے خطوں کے بارے میں یہ تصفیہ ہو جاتا ہے کہ ان میں سے پانچ مولوی محمد علی خاں کے نام ہیں اور ایک کے مکتوب الیہ نواب علی اکبر خاں طباطبائی ہیں۔

مکتوب الیہم کے تعین کے بعد اگلا مرحلہ خطوط کی سلسلہ وار ترتیب کا تھا۔ فاضل مرتب نے اسے بڑی حد تک خوش اسلوبی سے طے کر لیا ہے۔ چنانچہ چار خطوں کو چھوڑ کر باقی خطوط کی ترتیب میں کسی ردّ و بدل کی گنجائش نہیں۔ اس ترتیب کا فیصلہ زیادہ تر داخلی شہادتوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں کسی نوع کی وضاحت نہیں کی گئی جو ایک عام قاری کے نقطۂ نظر سے از حد ضروری تھی۔ اس سقم سے اعراض کی بہترین صورت یہ تھی کہ حسبِ ضرورت توضیحات کے ساتھ ہر خط کی تاریخِ تحریر یا کم از کم زمانۂ تحریر کا تعین کر دیا جاتا۔ سات خطوں کی تاریخیں خود غالبؔ نے ان کے آخر میں تحریر کر دی ہیں مگر ان کے ساتھ سنہ کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ اس کمی کو بہ آسانی دور کیا جا سکتا تھا لیکن اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ اس فروگذاشت کے ازالے کی غرض سے جملہ خطوط سے متعلق اس سلسلے کی ضروری تفصیلات سطورِ ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:

(۱) یہ خط باندے میں ورود کے بالکل ابتدائی ایام میں لکھا گیا ہے، اس لیے اسے بجا طور پر سب سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ خط میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں جس سے اس کی قطعی تاریخ کا تعین کیا جا سکے۔

(۲) یہ خط بہ روزِ سہ شنبہ باندے سے اگلی منزل موداہا سے چلہ تارا پہنچنے کے بعد لکھا گیا ہے۔ ان خطوط کے حوالے سے باندے سے بنارس تک غالبؔ کے مرحلہ وار سفر کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں، ان کے مطابق اس خط کی تاریخِ تحریر ۲۰ نومبر ۱۸۲۷ء قرار پاتی ہے۔

(۳) یہ چلہ تارا سے لکھا ہوا دوسرا خط ہے۔ پہلا خط سہ شنبہ ۲۰ نومبر ۱۸۲۷ء کو غروب آفتاب کے وقت لکھا گیا تھا۔ یہ اس کے اگلے روز یعنی چہار شنبہ ۲۱ نومبر ۱۸۲۷ء کو الہ آباد کے لیے کشتی میں سوار ہونے کے بعد لکھا گیا ہے۔

(۴) یہ خط بنارس پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد لکھا گیا ہے۔ غالبؔ چہار شنبہ، ۲۱ر نومبر ۱۸۲۷ء کی دوپہر کو چلہ تارا سے روانہ ہو کر ساتویں دن یعنی ۲۷ر نومبر ۱۸۲۷ء کو الٰہ آباد پہنچے تھے او رایک دن ایک رات وہاں گزارنے کے بعد اگلے روز علی الصباح بنارس کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے جس تیز رفتاری سے اس سفر کا طے کرنا بیان کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۳۰ر نومبر یا زیادہ سے زیادہ یکم دسمبر کو بنارس پہنچ گئے ہوں گے۔ اس طرح یہ خط ۷ر یا ۸ دسمبر ۱۸۲۷ء کو لکھا گیا ہوگا۔

بنارس تک سفر کی ان تاریخوں کا تعین اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ غالبؔ نے محولۂ بالا چوتھے خط میں بنارس پہنچنے کے بعد ضروریات کی تکمیل کی غرض سے مجموعی طور پر چار ہفتے یہاں قیام کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور وہ یہاں سے سنیچر کے دن قمری مہینے کی دسویں یا گیارھویں تاریخ کو کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ (کلیاتِ نثر غالب، ص ۱۶۵) یہ قمری تاریخ صرف اور صرف ۱۰ر یا ۱۱ر جمادی الاخری ۱۲۴۳ھ ہو سکتی ہے، جو ۲۹ر دسمبر ۱۸۲۷ء کے مطابق ہے۔

(۵) اس خط کے مطابق غالبؔ سہ شنبہ چہارم شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے۔ خط میں غالبؔ نے مکتوب الیہ کو یہ اطلاع دی ہے کہ وہ دو دن آرام کرنے کے بعد ہوگلی گئے اور نواب علی اکبر خاں طباطبائی سے ملاقات کر کے دو تین گھنٹے کے بعد وہاں سے واپس آ گئے۔ دو دن کے وقفے کے بعد دوبارہ وہاں گئے اور دو دن اور ایک رات نواب صاحب کے مہمان رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط کلکتہ پہنچنے کے ساتویں یا آٹھویں روز ۲۶ر یا ۲۷ فروری ۱۸۲۸ء کو لکھا گیا ہوگا۔

(۶) خط کے درمیان میں ایک جگہ غالبؔ نے لکھا ہے کہ ''امروز چہاردہم شوال است و ناف ہفتہ یعنی روز سہ شنبہ'' اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خط سہ شنبہ، ۱۴ر شوال ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۹ر اپریل ۱۸۲۸ء کو لکھا گیا ہے۔

(۷) اس خط کے دو کلیدی جملے جن سے اس کی تاریخ کے تعین میں مدد ملتی ہے، حسب ذیل ہیں:

(ب) عرض داشت..... و عریضۂ محررہ ہشتم شہر مذکور کہ درلفِ مراسلۂ مخدومی جناب مولوی ولایت حسین صاحب سمتِ ترسیل یافتہ.....''

''پنج آہنگ'' کے مطابق اس دوسرے جملے میں مذکور عرض داشت سے مکتوب ''نگاشتۂ غرۂ ذی الحجہ'' مراد ہے۔ یہ اس مجموعے کا خط نمبر ۸ ہے جو اس سے ایک دن قبل ۲۹/ذی قعدہ، روزِ آدینہ کو موصول شدہ خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد دو مہینے دس دن تک مولوی محمد علی خاں کا کوئی خط غالبؔ کو نہیں ملا تھا۔ اس مدت کا نقطۂ آغاز ۹/صفر ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۱/اگست ۱۸۲۸ء کی تاریخ قرار پاتی ہے۔ یہی اس خط کی تاریخِ تحریر ہے۔

(۸) جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، یہ خط روزِ آدینہ ۲۹ ذی قعدہ (۱۲۴۳ھ مطابق ۱۳/جون ۱۸۲۸ء) کو موصول شدہ خط کا جواب ہے۔ خط کے بالکل آغاز میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ ''پس از اتمام مطالعہ.... مقطعِ آں سعادت نامہ مطلعِ ایں عرض داشت گردید۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جواب خط کے وصول ہونے کے دن ہی اس کے پڑھنے کے فوراً بعد لکھا گیا ہے۔ خط کے درمیان ایک جگہ اور بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ''امروز جمعہ است۔' مکتوب نمبر ۷ میں ''عرض داشت نگاشتۂ غرۂ ذی الحجہ'' سے یہی خط مراد ہے۔ تاریخوں میں ایک دن کے فرق کا سبب یہ ہے کہ اسے لکھنے کے دوسرے دن سپردِ ڈاک کیا گیا تھا۔ مکتوب نمبر ۲۱ میں ''عبودیت نامہ کہ در جواب والا نامہ بہ روزِ غرۂ ذی الحجہ ارسال یافتہ'' اور'' مکتوب مرسلۂ غرۂ ذی الحجہ'' سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس طے شدہ تاریخ (۲۹/ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۳/جون ۱۸۲۸ء) کی روشنی میں بہ لحاظ ترتیب اسے مکتوب نمبر ۷ (مورخہ ۹/صفر ۱۲۴۴ مطابق ۲۱/اگست ۱۸۲۸ء) سے پہلے جگہ ملنا چاہیے۔

(۹) اس خط کا کلیدی اندراج ''امروز روزِ چہل و دوم است کہ کواغذِ مقدمہ روانۂ دہلی کردہ ام'' ہے۔ مکتوب نمبر ۱۰ کے مطابق یہ کاغذات سہ شنبہ ۱۴/صفر (۱۲۴۴ھ مطابق ۲۶/اگست ۱۸۲۸ء) کو روانہ کیے گئے تھے۔ یہ خط اس کے بیالیسویں روز یعنی ۶/اکتوبر ۱۸۲۸ء مطابق ۲۶/ربیع الاول ۱۲۴۴ھ کو لکھا گیا تھا۔

(۱۰) اس خط کے درمیان میں دو جگہ تاریخ کا ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''امروز سہ شنبہ ہفدہم جمادی الاولیٰ است۔'' دوسری جگہ لکھا ہے کہ ''امروز کہ ہفدہم یا ہیزدہم جمادی الاوّل است۔'' ہفدہم جمادی الاولیٰ ۱۲۴۴ھ) سہ شنبے کی قید کے ساتھ ۲۵ نومبر ۱۸۲۸ء کے مطابق ہے۔ یہی اس خط کی تاریخِ تحریر ہے۔

(۱۱) اس خط کا خاتمہ مندجہ ذیل عبارت پر ہوا ہے:

جوابِ نوازش نامہ روزِ درودِ نوازش نامہ نوشتہ شد و آں ہفدہم یا بیز دہم جمادی الاول است و روزِ سہ شنبہ نیمے از روز برآمدہ۔ فاصلہ کہ در خواندنِ عنایت نامہ و تحریر عریضہ واقع شد، عرصۂ خوردنِ نان بود۔''

یہ عبارت دراصل مکتوب نمبر ۱۰ سے متعلق ہے۔ جو اصل خطوط کی بے ترتیبی یا ناقل کے سہو کی بنا پر اس خط کے آخر میں درج ہوگئی ہے۔ خط میں تاریخ کے تعین کا کوئی واضح قرینہ موجود نہیں۔ الا یہ کہ مکتوب الیہ کو یہ اطلاع دے کر کہ ''مولوی ولایت حسن ایں جانیستند'' ان کے توسط سے خط نہ بھیجنے کی استدعا کی گئی ہے۔ خط نمبر ۱۰ (مورخہ ۱۷ر جمادی الاوال ۱۲۴۴ھ) سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف اس سے دو ہفتے قبل دورے پر روانگی کے لیے پابہ رکاب تھے۔ اس لحاظ سے یہ خط جو غالباً دسمبر ۱۸۲۸ء کی کسی تاریخ کو لکھا گیا ہوگا، بہ اعتبارِ ترتیب صحیح جگہ پر رکھا گیا ہے۔

(۱۲) غالب نے اس خط کو ''معروضۂ چہارم رجب'' قرار دیا ہے۔ فاضل مرتب اگر صرف سنہ (۱۲۴۴ھ) کا اضافہ کر دیتے تو یہ تاریخ مکمل ہو جاتی۔

(۱۳) اس خط میں یہ واضح اشارہ موجود ہے کہ ''امروز روزِ دوشنبہ است از ہفتۂ نخستینِ رجب۔'' اس لحاظ سے از روئے تقویم یہ خط ۶ر رجب ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۲ر جنوری ۱۸۲۹ء کو لکھا گیا ہوگا۔ اس خط میں اس سے پہلے خط یعنی مکتوب نمبر ۱۲ مورخہ چہارم رجب کے متعلق غالب کا یہ بیان کہ ''نامہ رواں گشتہ رابیش از سہ روز گزشتہ'' مبنی بر سہو معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے اس خط کو بھیجے ہوئے تیسرا دن تھا، تین دن سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔

(۱۴) اس خط میں ایک جگہ یہ اطلاع دی گئی ہے کہ ''اکنوں آخرِ جنوری بردارِ اوائلِ فروری رفت۔'' اگلے خط (مکتوب نمبر ۱۵) میں غالب نے یہ بتایا ہے کہ ''روزِ سہ شنبہ، بست و ہفتمِ رجب عرض داشتے بہ خدمت فرستادہ بودم۔'' یہی سہ شنبہ بست و ہفتمِ رجب ۱۲۴۴ھ جو از روئے تقویم ۳ر فروری ۱۸۲۹ء کے مطابق ہے، اس خط نمبر ۱۴ کی تاریخ تحریر ہے۔ لیکن یہاں غالب یا کاتبِ بیاض سے سہو ہوا ہے۔ ''بست و ہفتم رجب'' کی بجائے صحیح تاریخ ''بست و ہشتم رجب' معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ غالب نے مکتوب نمبر ۱۶ میں ششمِ شعبان کو اور مکتوب نمبر ۱۷ میں

۱۳؍شعبان کو سہ شنبے کا دن بتایا ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں اگر ششم شعبان سے پہلے سہ شنبے کے ساتھ ۲۷؍رجب کی مطابقت کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ مہینا صرف ۲۸ دن کا قرار پائے گا۔

(۱۵) اس خط کے آخر میں نامکمل تاریخ تحریر ''چہارم فروری روز چہار شنبہ'' درج ہے۔ اگر اس پر ۱۸۲۹ء کا اضافہ کردیا گیا ہوتا تو یہ تاریخ مکمل ہو جاتی۔ ۴؍فروری ۱۸۲۹ء کو قمری تاریخ ۲۹؍رجب ۱۲۴۴ھ ہوگی۔

(۱۶) اس خط کے بارے میں غالبؔ کا بیان ہے کہ ''ایں عریضہ بہ تاریخ ششم شعبان بہ روز سہ شنبہ رقم کردہ ہماں روز فرستادہ آمد۔'' اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خط سہ شنبہ، ۶؍شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۰؍فروری ۱۸۲۹ء کو لکھا گیا تھا۔

(۱۷) یہ خط غالبؔ کی صراحت کے مطابق ''ہفدہم فروری مطابق سیزدہم شعبان روز سہ شنبہ'' کو لکھا گیا تھا۔ فروری کے ساتھ ۱۸۲۹ء، اور شعبان کے ساتھ ۱۲۴۴ھ کا اضافہ کر کے ان تاریخوں کو بہ آسانی مکمل کیا جا سکتا تھا۔

(۱۸) یہ خط چہارم رمضان روزِ سہ شنبہ'' کو لکھا گیا ہے۔ یہ تاریخ سنہ ۱۲۴۴ھ سے متعلق ہے۔ اس دن عیسوی تاریخ ۱۰؍مارچ ۱۸۲۹ء تھی۔

(۱۹) اس خط کی تاریخِ تحریر ''۱۳؍رمضان روزِ پنجشنبہ'' ہے جو ۱۲۴۴ھ سے متعلق ہے۔ اس کی مقابل عیسوی تاریخ ۱۹؍مارچ ۱۸۲۹ء تھی۔

(۲۰) اس خط میں غالبؔ کا بیان ہے کہ ''دی روز کہ سہ شنبہ سی ام شوال بود'' و ''امروز کہ چہار شنبہ غرۂ (ذی قعدہ است)۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط چہار شنبہ، غرۂ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۶؍مئی ۱۸۲۹ء کو لکھا گیا ہے۔

(۲۱) اس خط کا مندرجہ ذیل جملہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے:

''عبودیت نامہ کہ در جوابِ والا نامہ بہ روزِ غرۂ ذی الحجہ ارسال یافتہ... امروز کہ ہشتم ماہ است ہفتۂ براں (گزشتہ)۔''

فاضل مرتب نے اس اندراج کی روشنی میں اسے ۸؍ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ (۱۱؍جون ۱۸۲۹ء) کی تحریر قرار دے کر مکتوب نمبر ۲۰ مورخہ غرۂ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ کے بعد جگہ دی ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ خط ۸؍ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ کی بجائے ۸؍ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ (۲۱ جون ۱۸۲۸ء) کی تحریر

ہے۔ مکتوب نمبر ۷ میں مذکور ''عرض داشت نگاشتۂ غرّہ ذی الحجہ'' سے اول الذکر ''عبودیت نامہ'' اور ''عریضہ محررہ ہشتمِ شہرِ مذکور'' سے یہی خط مراد ہے۔ اس اعتبار سے اسے موجودہ خط نمبر ۸ کے بعد جگہ ملنا چاہیے تھی۔

(۲۲) اس خط کے درج ذیل دو جملے توجہ طلب ہیں:

(الف) نقلِ رپورٹ فرماں دہِ دہلی با ضمیمۂ حکمِ (صدر)..... درنوردِ ایں عرض داشت بہ والا خدمت می فرستم۔''

(ب) منشی عاشق علی خاں بہ تاریخِ یکم ذی الحجہ از کلکتہ بہ راہِ دریا رفتند۔''

دوسرے جملے سے واضح ہے کہ یہ خط یکم ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ کے بعد لکھا گیا ہے۔ مکتوب نمبر ۲۳ میں لکھتے ہیں:

''حالِ تظلّمے کہ جان ودلم رہینِ ..... تقاضاے اوست، غالب کہ از فحواے عرض داشت مرقومۂ روزِ عید بر ضمیرِ منیر ہویدا شدہ باشد۔ حکمِ (صدر کہ) نقلِ آں حرف بہ حرف بہ والا خدمتِ حضرت قبلہ گاہی فرستادہ ام۔''

اس بیان کی روشنی میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ یہ خط جس میں حکمِ صدر کی نقل بھیجنے کا ذکر اور عاشق علی خاں کے سفر کے سلسلے میں یکم ذی الحجہ کا حوالہ موجود ہے، ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ (۱۳ رجون ۱۸۲۹ء) کو لکھا گیا تھا۔

(۲۳) یہ خط ۸ رمحرم الحرام ۱۲۴۵ھ (۱۰ رجولائی ۱۸۲۹ء) کا لکھا ہوا ہے، چنانچہ اس کے شروع، وسط اور خاتمے میں یعنی تین جگہ 'امروز ہشتم محرم است''، ''در عرض ایں ماہ کہ از (ہفتم) ذی الحجہ تا ہشتمِ محرم سپری شدہ'' اور ''معروضۂ ہشتم محرم روزِ شنبہ'' جیسے واضح بیانات موجود ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ فاضل مرتب نے اپنی صواب دید کے مطابق پہلے اور آخری بیان میں ''ہشتم'' کو ''نہم'' سے بدل دیا ہے۔

(۲۴) اس خط میں صراحتاً یہ ذکر ہے کہ ''فردا روزِ شنبہ چہاردہمِ صفر و پانزدہمِ اگست (است)۔'' اس کے مطابق اس کی تاریخ تحریر جمعہ ۱۳ رصفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۴ راگست ۱۸۲۹ء قرار پاتی ہے۔

(۲۵) اس خط میں مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ شحنۂ شہر کے توسط سے

باندے سے بنارس تک ورنہ الہ آباد تک سفر کے لیے کشتی کا انتظام کرادیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط کلکتے کے سفر پر روانگی سے عین قبل اور باندے میں قیام کے بالکل آخری دنوں میں لکھا گیا ہے۔ خط میں یہ بھی مرقوم ہے کہ پنجشنبے کے دن سفر مبارک خیال کیا جاتا ہے، اس لیے میں کل روانہ ہو جاؤں گا ورنہ (بہ طور پاتراب) کچھ سامان آپ کے ہاں بھجوا کر پرسوں صبح شرفِ پابوسی حاصل کر کے اپنی راہ لوں گا۔ چوں کہ غالب کشتی کی بجائے بیل گاڑی سے روانہ ہو کر پنجشنبے ہی کے دن قریب ترین منزل مودہا پہنچے تھے، اس لیے قیاس یہ ہے کہ یہ خط اس سے ایک روز پہلے لکھا گیا ہوگا۔ باندے سے بنارس تک غالب کے مرحلہ وار سفر کی تفصیلات کے پیشِ نظر ہمارا خیال یہ ہے کہ اس دن نومبر ۱۸۲۷ء کی چودھویں تاریخ ہوگی۔ اس لحاظ سے اس خط کو موجودہ خط نمبر ا کے بعد جگہ ملنا چاہیے۔

(۲۶) یہ مختصر دستی رقعہ ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ ''مکتوب برائے روانگی کلکتہ می رسد۔ بہ یکے از خواجہ تاشانِ من فرماں رود کہ ایں را بہ کدۂ ڈاک برساند۔'' اس میں الہ آباد کا بھی ذکر آیا ہے لیکن اس سے پہلے کے ایک دو لفظ صاف نہیں اور بعد کے چند الفاظ ضائع ہو گئے ہیں، اس لیے یہ حوالہ غیر واضح ہے۔ البتہ یہ آخری جملہ کہ ''طاقتِ من دریں مرحلہ تمام شد'' اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ غالب اس وقت باندے میں تازہ وارد تھے اور ان پر سفر کی تکان غالب تھی۔ اس طرح بہ ظاہر یہ رقعہ کلکتے سے باندا پہنچنے کے فوراً بعد یعنی روز جمعہ، یکم جمادی الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۳۰ر اکتوبر ۱۸۲۹ء کے دوسرے تیسرے روز لکھا گیا ہوگا۔ یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ جو خط اس رقعے کے ساتھ کلکتے بھجوانے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ غالباً مولوی سراج الدین احمد کے نام تھا۔ ''متفرقاتِ غالب' میں ان کے نام کے پہلے ہی خط میں ''عرض داشتے کہ از باندا فرستادہ بودم'' کی صورت میں بہ ظاہر اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۲۷) اس رقعے میں بھی ایک خط اپنے آدمی کے ذریعے مکتوب الیہ کے پاس بھیجنے اور اسے ڈاک خانے بھجوانے کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ ''مکتوبِ موعودمی رسد.... نامہ را سراپا نگرستہ آدمے بہ ہم پائے حاملِ آں صحیفہ گمارند تا خط بہ ڈاک رساند۔'' یہ بہ ظاہر مکتوب نمبر ۲۸ تھا جو نواب علی اکبر خاں کے نام ہے اور جمادی الاول روزِ آدینہ کو کلکتے سے باندا پہنچنے کے چھٹے دن چہار شنبہ ۶ر جمادی الاولیٰ کو لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ رقعہ بھی ۶ر جمادی الاولیٰ ۱۲۴۵ھ مطابق ۴ر نومبر

۱۸۲۹ء کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(۲۸) جیسا کہ مکتوب نمبر ۲۷ کے ذیل میں بیان کیا گیا یہ خط خود غالبؔ کی تحریر کے مطابق "ششم جمادی الاول روزِ چہار شنبہ" کو لکھا گیا تھا۔

(۲۹) یہ خط "یکم جمادی الثانی روزِ یک شنبہ" کو دہلی پہنچنے کے پندھوی دن "پانزدہم جمادی الثانی ۱۲۴۵ ہجری" کو لکھا گیا ہے۔ تاریخ تحریر خط کے آخر میں درج ہے۔ اس کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۳/دسمبر ۱۸۲۹ء تھی۔

(۳۰) اس خط میں مکتوب الیہ کو مطلع کیا گیا ہے کہ "بہ تاریخ چہارم جنوری روز دوشنبہ مکتوبِ فرماں دہ دہلی بہ نام جاگیر دار فیروز پور بالِ روانی کشود۔" اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ خط ۴/جنوری ۱۸۳۰ء کے بعد اسی مہینے کی کسی قریبی تاریخ کو لکھا گیا ہوگا۔

(۳۱) اس خط میں نواب علی اکبر خاں سے "تا پایان فصل" دو تین بار آموں کے تحفے سے نوازنے کی درخواست کی گئی ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ خط ۱۸۲۸ء میں آموں کی فصل کے بالکل آغاز میں لکھا گیا ہوگا۔

یہ اکتیس خطوط وہ ہیں جنھیں فاضل مرتب نے سلسلہ وار نمبروں کے تحت درج کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک بہ ظاہر ناقص الاول خط اور بھی ہے جو اس مجموعے کے بالکل آغاز میں صفحہ ۸ پر نقل ہوا ہے۔ اسے خطوط کی اصل تعداد میں کیوں شامل نہیں کیا گیا، اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے نزدیک یہ باندے میں غالبؔ کے ورود کے بالکل ابتدائی ایام کی تحریر ہے اور اس کے مخاطب بھی مولوی محمد علی خاں ہی ہیں۔

پیش کردہ تفصیلات کی روشنی میں ہمیں متذکرہ ناقص الاول خط کو شامل کر کے ان خطوط کے درمیان ایک سے بتیس تک نیا سلسلہ نمبر قائم کرنا ہوگا۔ اس ترتیب جدید کے تحت مکتوب نمبر ۲۵ کو موجودہ مکتوب نمبر ایک کے بعد، مکتوب نمبر ۸ کو موجودہ مکتوب نمبر ۷ سے قبل اور مکتوب نمبر ۲۱ کو ان دونوں خطوط کے درمیان رکھنا ہوگا، یعنی آخر الذکر تینوں خطوط میں سب سے پہلے خط نمبر ۸، بعد ازاں نمبر ۲۱ اور ان دونوں کے بعد خط نمبر ۷ جگہ پائے گا۔

غالبؔ کے خطوط مختلف مجموعوں کی صورت میں مرتب ہوئے ہیں۔ اب تک دریافت

شدہ فارسی خطوط کے پانچ مجموعوں (پنج آہنگ، باغِ دو در، متفرقاتِ غالب، مآثرِ غالب اور نامہ ہاے فارسیِ غالب) میں سے ''باغِ دو در'' کے علاوہ باقی چاروں مجموعوں میں بیشتر خطوط مختلف ہونے کے باوجود چند خطوط مشترک بھی ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کسی بھی مجموعے کی تدوین کے وقت دوسرے دستیاب متون سے اس کے متن کا مقابلہ ضروری ہو جاتا ہے۔ ترمذی صاحب نے اس تقابلی مطالعے کی طرف توجہ تو ضرور فرمائی ہے لیکن ان کی یہ کوشش نہ تو تدوینِ متن کے اصولوں سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ جامع و مانع ہے۔ مثال کے طور پر اس مجموعے کا دوسرا خط جو کاغذ کی موش خوردگی یا آب رسیدگی کی وجہ سے ناقص ہے، پنج آہنگ میں بھی موجود ہے۔ فاضل مرتب نے موخر الذکر متن سے اس کا مقابلہ کر کے اس کے نقص کی تلافی کر دی ہے۔ لیکن اتفاقاً خط نمبر ۵ کے بعد یہی خط اس مجموعے میں دوبارہ نقل کر دیا گیا ہے اور یہاں اس کے وہ حصے جو اول الذکر نقل میں ضائع ہو چکے ہیں، پوری طرح محفوظ ہیں۔ مرتب کا فرض تھا کہ وہ اپنے مرتبہ نسخے کی تدوین کے وقت اس نقل کو بھی پیشِ نظر رکھتے۔ اس طرح انھیں ''پنج آہنگ'' کی مدد سے ضائع شدہ متن کی تکمیل کی ضرورت پیش نہ آتی اور اس نسخے کا مکمل متن اپنی اصل صورت میں سامنے آجاتا۔ تکمیلِ متن کی ان کی کوشش کے باوجود اس خط کا آخری جملہ ''بامداداں اگر حیات باقی است، پسیجِ راہ فتح پور خواہد شد'' ناقص ہے۔ قلمی اور مطبوعہ دونوں متون میں یہاں ''پسیج'' (پ س ی ج) کی بجاے ''بسیچ'' (ب س ی چ) منقول ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ ''فتح پور'' اور ''خواہد شد'' کے درمیان سے لفظ 'کردہ' حذف ہو گیا ہے جو دونوں بلکہ تینوں جگہ موجود ہے۔

موجودہ مکتوب نمبر ۷ کا نصفِ اول ''پنج آہنگ'' اور اس مجموعے میں مشترک ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس مجموعے میں اس کا آغاز ''قبلہ گاہا، بے کساں پناہا'' سے ہوا ہے جب کہ ''پنج آہنگ'' میں یہ القاب موجود نہیں۔ وہاں اس کی بجاے تین اشعار کی مثنوی سے ابتداے کلام ہوئی ہے۔ اس سلسلے کا پہلا شعر یہ ہے:

از جگرِ تشنہ بہ دریا سرود   وز تنِ بے جاں بہ مسیحا درود

اس اختلافِ ظاہری کی بنا پر فاضل مرتب دونوں متون کے درمیان متذکرہ اشتراک کی نشان دہی سے قاصر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس مجموعے کے متن کے بعض ناقص حصے جن کی

تکمیل مطبوعہ متن کی مدد سے بہ آسانی کی جاسکتی تھی، علی حالہٖ نامکمل رہ گئے ہیں۔

''پنج آہنگ'' کی اشاعت کے وقت غالؔب نے اصل خطوط میں دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ معمولی لفظی ترمیم و تغیر کی مثالیں تو بہ افراط موجود ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر بعض خطوں سے ان کے کچھ حصے یکسر قلم زد کردیے ہیں جب کہ بعض خطوط کی تلخیص کرکے انھیں اصل کی بہ نسبت بے حد مختصر کردیا ہے اور بعض حصوں کو ایک مکتوب سے نکال کر دوسرے مکتوب میں شامل کردیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعے کا خط نمبر ۷، اصلاً ''نامہ ہاے فارسی غالب'' کے مکتوب نمبر ۸ کی تلخیص ہے، جس کی طرف فاضل مرتب نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے حالانکہ صفحہ نمبر ۳۹ کی دسویں سطر میں ''پنج آہنگ'' کے حوالے سے ایک ضائع شدہ لفظ کا اضافہ کرکے انھوں نے دونوں مجموں کے درمیان اس خط کے اشتراک سے اپنی واقفیت کا اظہار کردیا ہے۔ ''پنج آہنگ'' میں اس خط کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

قبلہ گاہا، بے کساں پناہا! شگرفیِ آثارِ رحمتِ الٰہی است کہ آب و
ہواے کلکتہ با من نیک در ساخت۔''

''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' کا مکتوب نمبر ۱۸ اس مجموعے کے صفحہ نمبر ۳۶ کی نویں سطر سے شروع ہوکر صفحہ ۴۳ کی پہلی سطر پر ختم ہوا ہے۔ ''شگرفیِ آثارِ رحمتِ الٰہی'' والا جملہ اس کے صفحہ نمبر ۳۸ کی پہلی سطر میں آیا ہے۔ ''پنج آہنگ'' میں یہ خط کل اکیس سطروں پر مشتمل ہے، جس میں ایک رباعی بھی شامل ہے، جو ''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' میں موجود نہیں۔

مکتوب نمبر ۱۲ صفحہ نمبر ۵۵ سے صفحہ نمبر ۵۸ تک بہ طور مجموعی ''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' کے تین صفحات کو محیط ہے۔ اس کے آخری صفحے میں دو جگہ ''پنج آہنگ'' کے حوالے سے بعض ناقص عبارات کی تکمیل کی گئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہے کہ دونوں مجموعوں میں اس خط کے اشتراک سے فاضل مرتب باخبر ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے دقتِ نظر کے ساتھ دونوں متون کا مقابلہ نہیں فرمایا اور نہ صفحہ نمبر ۵۶ کے بعض ناقص جملوں کی بھی بہ آسانی تکمیل ہوجاتی۔ یہ خط اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ غالؔب نے ''پنج آہنگ'' کی اشاعت کے وقت ان خطوط میں جس قسم کی غیر معمولی بلکہ غیر متوقع تبدیلیاں کی ہیں، اس کی وساطت سے ان کے دو اہم نمونے سامنے آئے ہیں۔
''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' میں اصل خط کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

''انچہ پس از تسلیمات بہ معرضِ بیاں باید آورد، نخست این است کہ روزگارے گزشتہ کہ ہمائے والا نامہ بہ سرم سایہ گستر نہ گشتہ۔''

اس کے برعکس ''پنج آہنگ'' میں اس خط کی ابتدا اس مختلف فیہ بیان سے ہوئی ہے:

''انچہ پس از عرض تسلیمات بہ معرضِ بیاں تواند آمد، اینست کہ ہمائے والا نامہ بہ سرم سایہ گستر گشت و مرا در قلمروِ شادمانی جہاں بانی داد۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ نے عبارت آرائی کی خاطر الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بیانِ واقعات میں بھی حسب دل خواہ ردّو بدل کیا ہے۔ خط کا آنا اور نہ آنا بالکل متضاد واقعات ہیں۔ یہاں ایک کو دوسرے سے بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

دوسرا غور طلب معاملہ جو اس خط کے حوالے سے سامنے آیا ہے، یہ ہے کہ ''پنج آہنگ' میں اس خط کے تمہیدی جملوں کے فوراً بعد کی آٹھ سطری عبارت جو ''من و خدا کہ ہنگامِ تحریر عبودیت نامہ'' سے شروع ہو کر ''تا در غم کدہ مشاعت بجا آوردم و بہ خدا سپردم'' پر ختم ہوئی ہے، ''نامہ ہائے فارسیِ غالب'' کے مطابق ایک دوسرے خط سے تعلق رکھتی ہے جو اس مجموعے میں دسویں نمبر پر درج ہے۔ فاضل مرتب کی نگاہ ان دونوں خطوں کے درمیان اس جزوی اشتراک تک پہنچنے سے قاصر رہی، اس لیے ''نامہ ہائے فارسی غالب'' کی تدوین کے وقت وہ دونوں متون کا مقابلہ کر کے زیرِ ترتیب متن کے لفظی خلا بھی پُر نہ کر سکے۔ اس سے بھی اہم تربات جس کی طرف یہاں توجہ دلانا مقصود ہے، یہ ہے کہ غالبؔ نے بعض اوقات دو مختلف خطوں کے حصے ملا کر ایک تیسرا خط بنا دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے، ''نامہ ہائے فارسیِ غالب'' جس بیاض پر مبنی ہے، اس کے اوراق کا ایک خاص حصہ از اول تا آخر موش خوردگی یا آب رسیدگی کے باعث ضائع ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں عباراتِ کے بعض حصے غیر مربوط ہو گئے ہیں۔ فاضل مرتب نے ان میں سے چند مقامات پر ''پنج آہنگ'' کے حوالے سے ان ضائع شدہ حصوں کی تکمیل فرمادی ہے۔ چار چھے جگہ قیاس سے کام لے کر بھی مناسب الفاظ داخلِ متن کر لیے ہیں۔ لیکن بیشتر مقامات پر

نقطے لگا کر ان جگہوں کو خالی چھوڑ دیا ہے۔ بہ ظاہر اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ تاہم اگر ان مکاتیب میں غالبؔ کے استعمال کردہ الفاظ، تراکیب، محاورات، تلازمات اور ان سب سے بڑھ کر ان کے اسلوب کا گہرائی سے مطالعہ کر لیا گیا ہوتا تو مزید چند مقامات پر اصل الفاظ کی بازیافت یا بہ اعتبارِ مفہوم ان کے قریب تک رسائی ممکن تھی۔ سطورِ ذیل میں ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ''چہ ناسپاسی است در عرضِ ایں مباہات برخود نہ بالیدن و چہ حق ناشناسی است در تلافی..... دیدہ بر کفِ پا نہ مالیدن۔'' (ص)

''تلافیِ مافات'' ایک عام اور کثیر الاستعمال ترکیب ہے۔ یہاں اسی کا موقع ہے۔ ''مباہات'' اور ''مافات'' کی ہم قافیگی بھی اس کا جواز فراہم کرتی ہے۔

(۲) ''نہ دروے دوائے درخورِ بیمار و نہ متاعے شائستۂ مردم بزم..... در مرد و زنش ناپید او مہر و آزرم از طبعِ پیر و جوانش گم۔'' (ص ص ۲۰ و ۲۱)

یہاں لفظ ''مردم'' کے بعد ''بزم'' کی کوئی مناسبت نہیں، البتہ ''مرد و زن'' اور ''مہر و آزرم'' کی مناسبت سے ''شرم و حیا'' کا قرینہ ہے۔ امکانِ قوی ہے کہ غالبؔ نے یہی لکھا ہوگا۔

(۳) ''بہ درِ نواب صاحب.... نخست رو بہ سوے ایوانے کہ ضریحِ جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا در و بود، آوردم و زیا.... چوں بہ گوشۂ قربِ مخدومی رسیدم، از فرطِ عنایت برخاستند وا.... در انتظارِ تو روزہا گزشت۔ چوں از کیفیتِ منشاءِ انتظار پرسیدہ شد، ایں معنی گل..... نواب صاحب رسانیدہ اند و بے ذریعۂ ملاقاتِ صوری روشناسِ معنوی گردانیدہ۔ روز ملاقات.... درمیاں نیامد۔'' (ص ۲۷)

مختلف قرائن و قیاسات کی بنیاد پر اس عبارت کے بیشتر حصوں کی تکمیل اس طرح کی جا سکتی ہے:

''بہ درِ نواب صاحب (رسیدہ).... نخست رو بہ سوے ایوانے کہ ضریح

سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنادرو بود، آوردم وزیا(رت کردم و فاتحہ خواندم۔ پس ازاں) چوں بہ گوشۂ قربِ مخدومی رسیدم، از فرطِ عنایت برخاستند وا(استقبال کردند و ارشاد فرمودند کہ) درانتظار تو روزہا گزشت۔ چوں از کیفیتِ منشائے انتظار پرسیدہ شد، ایں معنی گل (کرد کہ خبرِ رسیدن رہی بہ کلکتہ جناب مخدومی بہ) نواب صاحب رسانیدہ اندو بے ذریعۂ ملاقات صوری روشناسِ معنوی گردانیدہ۔ روز ملاقاتِ (نخستیں گفتگوے درباب مقدمہ) درمیاں نیامد۔"

ضریح سید الشہدا تک پہنچنے کے بعد زیارت کرنا اور فاتحہ پڑھنا ایک بدیہی امر ہے۔ علاوہ بریں "آوردم" کے بعد "وزیا" کی موجودگی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگلا لفظ "زیارت" ہوگا۔ باقی الفاظ مخطوطے میں بچی ہوئی جگہ کے تناسب اور موقع و محل کی مناسبت سے لائے گئے ہیں۔ اسی طرح "برخاستند" کے بعد مخطوطے میں "وا" کے بعد سین کے شوشے کی موجودگی موقعے کی مناسبت سے "استقبال" کے استعمال کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس سے اگلے جملے میں "گل" کے بعد "کرد" اس کے جز کے طور پر لازماً موجود ہوگا کہ "گل کردن" بہ معنی ظاہر و نمودار شدن مشہور فارسی محاورہ ہے۔ باقی الفاظ دوسرے ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر حسبِ حال اضافہ کیے گئے ہیں۔ آخر میں "روزِ ملاقات" اور "درمیان نیامد" کے درمیان قیاسی اضافے کا جواز یہ ہے کہ نواب صاحب سے مکتوب نگار کی یہ اولین ملاقات تھی جو "دو سہ ساعت" تک محدود رہی۔ تھوڑا آگے بڑھ کر اسی خط میں دو روز کے بعد دوبارہ صاحبِ موصوف کے دولت کدے پر حاضری دینے، "دو روز و یک شب" باہم صحبت رہنے اور "حالِ مقدمہ مفصل" بیان کیے جانے کا ذکر موجود ہے۔

(۴) "عرض داشت..... و عریضہ محررہ ہشتم شہرِ مذکور کہ درلفِ مراسلۂ مخدومی جناب مولوی ولایت حسن صاحب سمتِ ترسیل یافتہ۔" (ص ۳۳)

اس خط کا ابتدائی حصہ "پنج آہنگ" میں موجود ہے۔ اس کے مطابق "عرض داشت"

اور ''وعریضہ'' کے درمیان سے ضائع شدہ الفاظ ''نگاشتۂ غرۂ ذی الحجہ'' ہیں لیکن اسی مجموعے کے مکتوب نمبر ۲۱ کے مطابق ''نگاشتۂ غرۂ ذی الحجہ'' کے مقابلے میں ''مرسلہ غرۂ ذی الحجہ'' قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ خط بست ونہم ذی قعدہ کو لکھا اور غرۂ ذی الحجہ کو روانہ کیا گیا تھا۔

(۵) ''کوتاہی سخن.... ہر چہ از ہر عالم فراہم آمدہ بود۔'' (ص ۳۴)

یہاں ''کوتاہی سخن'' کے بعد قرینہ صرف ''ایں کہ'' کا ہے۔ اس پیرایۂ بیان کی مثالیں غالب کی تحریروں میں جابہ جا موجود ہیں۔

(۶) ''نہ مادر امادر (گفتن)...خواندن'' (ص ۳۲)

یہ بیان مرزا یوسف کی دیوانگی کی کیفیت سے متعلق ہے۔ آگے چل کر اسی خط میں لکھا گیا ہے کہ ''زن و دختر و مادر را زن و دختر و مادر دانستن ملکۂ او گشتہ است۔'' (ص ۳۳) اس مناسبت سے متن کے اس خلا کو ''نہ زن و دختر را زن و دختر'' کا اضافہ کر کے پورا کیا جا سکتا ہے۔ ''گفتن'' کو بین القوسین رکھنے کی بجائے شاملِ متن کر لینا چاہیے تھا کیوں کہ مخطوطے میں اس کے ابتدائی تینوں حرف پوری طرح واضح ہیں۔

(۷) ''کارفرما آں را...ہنوز وکالتش از قوہ بہ فعل نیامدہ بود کہ داور رخت سفر بر بست و بہ عزم دورہ بال نہضت.... انتظارِ باز گردیدنش در پیش است۔'' (ص ۵۶)

فاضل مرتب نے اس خط کے آخری حصے کا ''پنج آہنگ'' کے مکتوب نمبر ۹۷ سے مقابلہ کیا ہے لیکن انھوں نے اس کے دو درمیانی حصوں کو جو بہ ادنیٰ اختلاف دونوں متون کے درمیان مشترک ہیں، یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ''پنج آہنگ'' کے مطابق مندرجہ بالا عبارت کے خلا کو اس طرح پر کیا جا سکتا تھا:

> ''کارفرما آں را (پزیرفت و وکالت نامہ بہ وکیل داد) ہنوز وکالتش از قوہ بہ فعل نیامدہ بود کہ داور رختِ سفر بر بست و بہ عزم دورہ بال نہضت (کشاد۔ ہر آئینہ) انتظار باز گردیدنش در پیش است۔''

اس خط کا دوسرا درمیانی نامکمل حصہ جس کی تکمیل ممکن تھی، حسب ذیل ہے:

''چنانچہ فقیر..... عجز وانکسار خویش رقم کردہ است۔'' (ص ۵۸)

''پنج آہنگ'' میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

''چنانچہ بہ فرمان ایں ہر دو بزرگوار مثنویۓ انشا کردہ ام و بعد از اظہار عجز و انکسار خویش.......''

اس بیان کی روشنی میں منقولۂ بالا عبارت کو اس طرح مکمل کیا جا سکتا تھا:

''چنانچہ فقیر (حسب فرمانِ ایں ہر دو بزرگوار مثنویۓ در اظہار) عجز و انکسارِ خویش رقم کردہ است۔''

(۸) ''نواب سید علی اکبر خاں..... ہرگاہ از ہوگلی می آید، نمی شود کہ بہ ورودِ خود سرم را..... ایں دیار از راہِ حسد با من درافتادہ بودند۔'' (ص ۶۲)

مخطوطے میں ''سرم را'' کے بعد ''سپہر'' صاف طور پر نمایاں ہے۔ اس لحاظ سے خالی جگہ کو ''بہ سپہر نیفرازد۔ مردمان'' سے پُر کیا جا سکتا ہے۔

(۹) ''روز سہ شنبہ بست و ہفتم رجب عرض داشتے بہ خدمت فرستادہ..... برنگشتہ بود کہ بریدے از بریدانِ ڈاک رسید و ربو بیت رقم نامۂ والا رسانید۔''

بر بناۓ قیاس اس عبارت کی تکمیل اس طرح کی جا سکتی ہے:

''روز سہ شنبہ بست و ہفتم رجب عرض دشاتے بہ خدمت فرستادہ (بودم۔ ہنوز برندۂ آں عرض داشت از کدۂ ڈاک) برنگشتہ بود کہ بریدے از بریدانِ ڈاک رسید و ربو بیت رقم نامۂ والا رسانید۔''

(۱۰) ''جناب ممدوح لختے سخن بہ مذاقِ اہلِ وحدتِ وجود.... از شیوۂ اخلاقِ شمع و چراغ انجمن.....'' (ص ۶۵)

اس خط کا مقابلہ ''پنج آہنگ'' کے مکتوب نمبر ۸۰ سے کیا گیا ہے لیکن دونوں متون میں اشتراکِ عبارات کے باوجود اس خلا کو باقی چھوڑ دیا گیا ہے۔ موخر الذکر متن کے مطابق اس کی صورت حسب ذیل ہوگی:

''جناب ممدوح لختے سخن بہ مذاقِ اہلِ وحدتِ وجود می رانند و از یں نمد کلاہے دارند۔ مرا از شیوۂ اخلاقِ شمع و چراغ انجمن.....''

(۱۱) ''جوابِ تفقد نامۂ میر احمد علی خاں صاحب.....درنوردِ شقۂ حضور (ملفوف بودہ) سمتِ ارسال یافت۔'' (ص ۶۶)

یہاں ''درنوردِ شقہ'' کی مناسبت سے ''ملفوف بودہ'' کی بجائے ''فرو پیچیدہ'' ہونا چاہیے تھا۔

(۱۲) رقعۂ جناب مولوی فضلِ حق صاحب کہ درخطِ خانگی از دہلی رسیدہ است.....ایں عرض داشت می رسد۔'' (ص ۷۰)

غالبؔ کے زیرِ استعمال الفاظ کی روشنی میں اس خلا کو ''درنوردِ'' سے پر کیا جا سکتا ہے۔

(۱۳) ''درعرضِ ایں ماہ کہ...ذی الحجہ تا ہشتم محرم سپری شدہ۔'' (ص ۸۳)

اس عبارت سے عین ماقبل یہ بات کہی جا چکی ہے کہ ''تا ہفتم ذی الحجہ دہم جون بود حاکم پرسشش نہ کردہ۔'' اس اعتبار سے یہاں 'درعرض ایں ماہ کہ (از ہفتم) ذی الحجہ تا ہشتم محرم سپری شدہ'' ہونا چاہیے۔

(۱۴) ''از تحریر اعیان وطن معلوم شد کہ تا ہفتم ذی الحجہ مطابق بود، باز پرسے بہ میاں نیامدہ۔'' (ص ۸۶)

یہ وہی واقعہ ہے جس کا حوالہ اوپر کی سطور میں آچکا ہے، اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں عبارت کی شکل اصلاحِ ذیل ہوگی:

''از تحریر اعیانِ وطن معلوم شد کہ (تا دہم جون کہ) با ہفتم ذی الحجہ مطابق بود، باز پرسے بہ میاں نیامدہ۔''

(۱۵) ''دریا بہ وجودِ خویش موجے دارد۔ خس پندارد کہ...ایں واقعہ تفصیل می خواہد۔''

یہ نثر کی عبارت نہیں، ایک رباعی کی دوسری بیت ہے جو اس طرح مشہور ہے:

دریا بہ وجودِ خویش موجے دارد   خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

اس قسم کی کچھ اور مثالیں سیاق و سباق کی وضاحت کے بغیر بین القوسین مناسب الفاظ کا اضافہ کر کے سطورِ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ''دوعرض داشت کہ یکے (بہ وساطتِ) گردوں بان و یکے بہ سفارتِ شخصے نا آشنائے مجہول الاحوال مرسل گردیدہ است۔'' (ص ۲۰)

(۲) ''اگراز (وفور) سبزہ وگلِ اطرافش فصلے فرو خوانم، بیاباں دربیاباں بہارستاں۔'' (ص ۲۲)

(۳) ''تازمانے کہ اشعار موضحِ اسمِ ممدوح را (حک نسازند)، آں قصیدہ رابہ کسے نمایند۔'' (۲۹)

(۴) ''بہ خاطر گزشت کہ سطرے چنداز حالِ کثیرالاختلالِ خود (ہم بنویسد)۔'' (ص ۳۵)

(۵) ''بہ تصوف والحادوزندقہ (متہم گردانید)۔'' (ص ۳۸)

(۶) ''خواجہ حاجی آں کس است کہ احمد بخش خاں اورا (از اقربائے) عمِ من وانمودہ۔'' (ص ۳۸)

(۷) ''بامن درملاقات (مراسمِ تقدیم) و مشائعت بجا آورد۔'' (ص ۳۸)

(۸) ''عہدہ اش ہمین است کہ (عرائضِ) دادخواہاں راازپارسی بہ انگریزی نقل می کند۔'' (ص ۳۸)

(۹) ''خاطر (جمع دارید) کہ حق شما بر سرکار ثابت است۔'' (ص ۳۹)

(۱۰) ''برائے گزشتنِ عرائضِ (داد خواہاں) دوروز از ہفتہ مقرر است۔'' (ص ۳۹)

(۱۱) ''سخن رامی فہمد و بہ لطفِ (سخن) وامی رسد۔'' (ص ۳۹)

(۱۲) ''فرداکہ دوشنبہ است (بہ دفتر کدہ خواہم رفت۔ اگر) بار دہد بہتر۔'' (ص ۳۹)

(۱۳) ''ایں کس من جملۂ صاحبانِ (کونسل است کہ) فریزر

صاحب پیش کار و پیش دست او یند۔'' (ص ص ۳۹ و ۴۰)

(۱۴) ''میر کرم علی با ہمہ گرم جوشی و کوچک (دلی) پاسخے نہ فرستادہ اند۔'' (ص ۴۱)

(۱۵) ''دریں وہلہ کہ عرض داشت بہ خدمت خواہم فرستاد، (ایں مثنوی ہم ملفوف) خواہد بود۔'' (ص ۵۸)

(۱۶) ''پیش ازیں ولیم بیلی صاحب..... بہ جانبِ ملکِ برہما (رفتہ بودند) چنانکہ ہفتۂ (گزشتہ) کہ ولیم بیلی صاحب بہ کلکتہ داخل شدہ اند۔'' (۶۰)

(۱۷) ''اکنوں (شادی) کہیں دخترِ جنابِ ممدوح درپیش است۔'' (ص ۶۲)

(۱۸) ''نظارہ فروز رقمے موسومۂ مخدومی (ومطاعی مولوی ولایت حسن صاحب) دام شوکتۂ درنظر جلوہ کرد۔'' (ص ۶۳)

(۱۹) ''حالے کہ درخورِ نگارش بود، درعرائضِ سابق (سمتِ تحریر یافتہ۔ بہ زمانِ) خویش ہر یک ازنظر خواہد گزشت۔'' (ص ۶۶)

(۲۰) ''مرزا اوزبک جان برادر وقوتِ (بازوے من است)۔'' (ص ۷۲)

(۲۱) ''امید کہ روز ورودِ ایں عرض داشت (مکتوب بہ منشی محمد حسن) فرستادہ آید۔'' (ص ۸۴)

(۲۲) ''پس ازاں مثلِ (رپورٹ فرماں دہِ دہلی) بہ طریق آخر بہ کف افتاد۔ در انتظار آں بودم کہ اینک رپورٹِ ثانوی از دہلی می رسد وحقا کہ انتظار (ش غلط نبود)، اما خلافِ مقصد روے داد۔'' (ص ۸۶)

(۲۳) ''معہذا ارضاے داور (ہم ہمیں) بود۔'' (ص ۸۷)

(۲۴) ''خواستہ ام (کہ ازیں جاتا باندا بہ کشتی) برسم وازاں جاتا

دہلی بہ خشکی قدم زنم۔'' (ص ۸۷)

(۲۵) ''بہ بندۂ از بندگانِ درِ دولت (مخدومی فرماں رسد کہ) بہ کوتوالی چبوترہ رفتہ....'' (ص ۸۹)

فاضل مرتب نے اصل بیاض سے متن کے نقل کرنے میں بھی پوری احتیاط سے کام نہیں لیا ہے، چنانچہ کہیں کہیں بعض ایسے الفاظ یا فقرے شاملِ متن ہونے سے رہ گئے ہیں جن کے غائب ہوجانے سے یا تو عبارت بے ربط ہوگئی ہے یا مصنف کا مافی الضمیر پوری طرح واضح نہیں ہوسکا ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جو الفاظ یا فقرے سہواً چھوٹ گئے ہیں انھیں قوسین میں رکھا گیا ہے:

(۱) ''لالہ وگل از نقابِ (استعدادِ) کفِ خاکم سربرآوردہ۔'' (ص ۱۰)

(۲) ''مکتوب نمبر۲ (صفحہ ۱۶) اصل بیاض میں دوبار نقل ہوا ہے۔ دوسری نقل کا اختتام ''راقم اسد اللہ'' پر ہوا ہے۔ فاضل مرتب نے اسے نظر انداز کردیا ہے۔

(۳) ''فقیر پارۂ در بہم رسانیدنِ نقل کو انغذ (تگاپوے کرد۔ چوں دشوار دید، از سرِ آں در گزشتہ و آں کو انغذ) را خصوصاً دفترِ سرکار را عموماً در مقدمۂ خود بہ استشہاد قرار گرفتہ۔'' (ص ۳۰)

(۴) ''امید کہ غالب ختہ را جویاے خبر دانستہ (آں نکنند) کہ ہفتہ ہفتہ و ماہ ماہ گزرد، بہ نامہ یاد نیارند۔'' (ص ۵۹)

(۵) ''دو عدد باے'' ادب'' کہ ریختن پاے ادب افادۂ آں می اند، (بکاہند)۔'' (ص ۸۵)

(۶) ''رسیدنِ ایں عریضہ (بریاراں) مجہول ماند تا بہ شکنجۂ شکایتم نکشند۔'' (ص ۹۵)

(۷) 'بعدِ دو روز کہ دوبارہ میت افتاد۔'' (۲۷)

یہاں اصل بیاض میں ''دوبارہ'' اور ''مبیت'' کے درمیان کے چند الفاظ ضائع ہوگئے ہیں۔ فاضلِ مرتب نے ان کی رعایت سے ان دونوں لفظوں کے مابین خلا کی نشان دہی نہیں فرمائی ہے جس کے نتیجے میں یہ عبارت بہ ظاہر مسلسل ہوگئی ہے۔ ہمارے نزدیک مناسب الفاظ کے ذریعے اس کی تکمیل اس طرح کی جاسکتی ہے:

''بعدِ دوروز کہ دوبارہ (رفتم و بر دولت کدہ اش اتفاقِ) مبیت افتاد۔''

بعض الفاظ غلط پڑھے گئے ہیں یا صریحاً غلط ہونے کے باوجود جوں کے توں نقل کرلیے گئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) ''قطعِ نظر از مقراض و آرائش عنوان عذر ناتمامی تحریرِ قبول باد۔'' (ص ۱۷)

ہمارے نزدیک یہاں لفظ ''مقراض'' بالکل بے محل ہے۔ مخطوطے میں یہ لفظ بہت واضح نہیں چنانچہ اسے ''معروض' بھی پڑھا جاسکتا ہے اور یہی مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

(۳) ''اعجازِ آں مشتِ ہوا غبارم راچوں علمِ فتح برافراخت۔'' (ص ۲۱)

یہ متن مخطوطے کے عین مطابق ہے لیکن غلط ہے۔ صحیح صورت یہ ہوگی کہ لفظ ''مشتِ'' کو ''ہوا'' کے بعد اور ''غبار'' سے پہلے رکھا جائے (اعجازِ آں ہوا مشتِ غبارم را)۔ مناسب ہوتا کہ مرتب اس سہو کی اصلاح کر کے حاشیے میں وضاحت فرمادیتے۔

(۴) ''بہ عرضِ روانیِ بحرِ طوفاں خروش گنگش خانۂ ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ سیلابی است و بہ جلوہ گاہِ پری چہرگانِ (سبزہ رنگ) کتاں خانۂ قدسیاں ماہتابی۔'' (ص ۲۲)

یہ جملے گنگا اور پری رخانِ بنارس کی تعریف سے متعلق ہیں، اس کے باوجود یہاں ''گنگش'' کا موقع و محل نہیں۔ یہ لفظ دراصل ''کِنگش'' (بہ کافِ عربی مکسور و کافِ فارسی مفتوح) ہے جس کے معنی ''صلاح و مشورہ'' کے ہوتے ہیں۔ ''خروش'' اگرچہ اصل متن کے مطابق ہے، تاہم ہمارے نزدیک صحیح لفظ ''خیزش'' معلوم ہوتا ہے۔ ''پری چہرگانِ سبزہ رنگ'' بھی ضائع شدہ الفاظ کے باقی ماندہ شوشوں کے مطابق اصلاً ''پری چہرگانش رنگ'' رہا ہوگا۔

(۵) ''گاہ از شدتِ پردلیہا افسردہ و رنجور و گاہ از تألمِ گردشِ ایام ستم رسیدہ۔'' (ص ۲۶)

اس عبارت میں لفظ ''پر دلی ہا'' بالکل بے محل بلکہ بے معنی ہے۔ اس کا نصف اوّل یقیناً ''برد'' ہے، جس کے معنی ''سردی'' ہوتے ہیں۔ 'لیہا' بہ ظاہر ''لیالی'' کی مسخ شدہ شکل ہے۔ ''پنج آہنگ'' میں اس جگہ لفظ ''لیالی'' ہی استعمال ہوا ہے۔ علاوہ برین غالبؔ نے یہ ترکیب اپنے مندرجہ ذیل شعر میں بھی استعمال کی ہے:

گرمِ فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردلیالی نے مجھے

معلوم ہوتا ہے کہ بیاض کے ناقل نے ''برد'' کے جزوِ اول ''بر'' کو ''پُر'' پڑھنے کے بعد ''دلیالی'' کو بے معنی قرار دے کر ''دلی ہا'' سے بدل دیا ہے۔ فاضل مرتب نے اس خط کے متن کا مقابلہ ''پنج آہنگ'' کے متن سے کیا ہے۔ اس لیے اگر صحیح لفظ (بردِلیالی) کو متن میں داخل کر کے حاشیے میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

(۶) ''ہر مقدمہ را کہ درخورِ کونسل ندانند، مدعی المقدمہ راخود جواب دہند۔'' (ص ۳۱)

یہاں ''مدعی المقدمہ'' کی بجائے ''مدعیِ آں مقدمہ'' ہونا چاہیے تھا۔

(۷) ''فردا دوشنبہ است۔'' (۳۹)

یہاں متن کی صحیح صورت ''فردا کہ شنبہ است'' ہے کیوں کہ چند سطر قبل ہی یہ کہا جا چکا ہے کہ ''امروز جمعہ است۔''

(۸) ''گر یزی مرا برآں داشت کہ خود بہ بازار رفتم و دو سہ جا پژوہش کردم۔'' (ص ۵۱)

اس جملے کا پہلا لفظ بے فارسی کے ساتھ ''گریزی'' نہیں، بائے عربی کے ساتھ ''گر بزی'' ہے۔ یہ لفظ اس مجموعے میں ایک اور جگہ بھی آیا ہے (صفحہ نمبر ۸۱، سطر نمبر ۱۷)۔ وہاں املا درست ہے۔

(۹) ''چوں عددِ لفظ ''تعزیت سرائے'' بفزایند، ۱۲۴۴ھ می شود۔'' (ص ۸۵)

(۱۰) ''بہ وطن می روم لمّا دل تنگ و باچرخ و ستارہ در چنگ۔'' (ص ۹۱)

یہاں لفظ ''چنگ'' اصل متن کے مطابق ہے لیکن موقع ''جنگ'' کا ہے، ''چنگ'' کا نہیں۔

اسی قبیل کی کچھ اور مثالیں غلط لفظ کے بالمقابل صحیح لفظ قوسین میں درج کر کے سطورِ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ''وفورِ ناتوانی سراپاے مراصد شکنے (صد شکن) چوں بسترِ بیمار برروے ہمی (برروے ہم) چیدہ است۔'' (ص ۹)

(۲) ''طاقت تارخ (طاقت بارخِ) سفر برابر گشت۔'' (ص ۹)

(۳) ''سیہ مستانہ رحیق شعلہ بہ پیمانہ می بودم (پیمودم)۔'' (ص ۱۰)

(۴) ''اکابرِ آں سرکار تقریب یار فروشیہا (بادفروشی ہا) برانگیختہ رنگِ تعارف بہ حضورِ امیر ممدوح ریختند۔'' (ص ۱۳)

(۵) ''دلِ دردمحرم دوا محروم ملمع (طمعِ) مرہم دارد۔'' (ص ۱۵)

(۶) ''نالۂ دل ہاے بے داد (بے درد) اہلِ ہوس راراہ بجاے نمی برد۔'' (۱۶)

(۷) ''یکے ازاں (دو عرض داشت باوجودِ) بارسائی (نارسائی) طالع بہ بزمِ قبول نگاہ رسیدہ باشد۔'' (ص ۲۰)

(۸) ''سروش (سوادش) پاے تختِ بت پرستاں۔'' (ص ۲۲)

(۹) ''رخت سفر کہ زمستاں رادر خواست (درخورست)۔'' (ص ۲۴)

(۱۰) ''توضیح ایں الہام (ابہام) وتفصیل ایں اجمال۔'' (۳۲)

(۱۱) ہرچہ از ہر عالم فراہم آمدہ بو، دراں ہر دو عریضہ بہ اجمالے کہ بر تفصیل مزید (چربد)، معروض راے جہاں آراے گشتہ۔'' (ص ۳۴)

(۱۲) ''اسبابِ ظاہر کہ اہلِ بینش بداں قال (فال) می زنند۔'' (ص ۳۴)

(۱۳) ''مرا از اقربای واجزای جناب (از اقرباواعزاے جناب) دانستہ.....'' (ص ۳۷)

(۱۴) ''نویسندگان آں ورق راںداق آگہی خامہ (خام) ونویسندہ راطرزِ (اظہار) مدعانا تمام است۔'' (ص ۷۴)

(۱) ''بعدِ غرۂ (عشرۂ) محرم الحرام بہ کلکتہ تشریف ورود خواہند بخشید۔'' (ص ۸۱)

(۱۶) ''فرماں دہان اطراف بہ طریق نذرورہ آوردہ وارمغاں (بہ طریقِ نذرورہ آوردہ وارمغاں) کہ از اقسامِ رشوت است،......''
(ص ۸۲)

(۱۷) ''ارمغاں ورہ آوردہ (ارمغان ورہ آورد) گو ہمہ سبدے از فواکہ وطبقے از نبات باشد۔'' (ص ۸۲)

(۱۸) ''ایں حکم چارۂ در رعیت نہ گردد (نکرد) وہیچ بہ حالِ حکام رسانید۔'' (ص ۸۲)

(۱۹) ''آدمِ من حال شناس (جادہ شناس) وقاعدہ دانِ ڈاک کدہ نیست۔'' (۹۰)

(۲۰) ''فطرت شفائی بیمار را (فطرتِ بیمار شفائے را) نمی پزیرد۔''
(ص ۹۵)

متن کی تحقیق وتدوین نہایت پیچیدہ اور دقت طلب کام ہے۔ اس کے اصول وآداب سے پوری واقفیت اور ان کے مکمل پاس ولحاظ کے بغیر یہ مہم کامیابی کے ساتھ سر نہیں کی جاسکتی۔ ان اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر متن میں درج کسی واقعے کی قمری تاریخ دن کے التزام کے ساتھ مذکور ہے تو اس کی مقابل عیسوی تاریخ کا تعین اس دن کے مطابق کیا جائے گا۔ فاضل مرتب اس ضابطے سے واقف نہیں چنانچہ انھوں نے تقویم سے مطابقت کی خاطر جابہ جا واقعات کی اصل تاریخیں بدل ڈالی ہیں۔ مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) غالب نے اپنے کلکتے پہنچنے کی تاریخ ''سہ شنبہ چہارم شعبان'' بتائی تھی۔ (۲۶) از روئے تقویم شعبان (۱۲۴۳ھ) کی چوتھی تاریخ کو چہار شنبہ تھا، اس لیے فاضل مرتب نے ''سہ

شنبہ" کی اصلاح فرما کر اسے "چہار شنبہ" بنا دیا ہے۔ اس طرح اس کی مطابق عیسوی تاریخ ۲۰ر فروری ۱۸۱۸ء قرار پائی، جب کہ غالب اس سے ایک دن قبل سہ شنبہ، ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچ چکے تھے۔

(۲) "بست و نہم ربیع الاول روزِ پنجشنبہ پاسے از روز برآمدہ بود۔" (ص ۴۳)

یہاں بھی اصل متن میں "روزِ آدینہ" تھا۔ چوں کہ تقویم کی رو سے ربیع الاول (۱۲۴۴ھ) کی انتیسویں کو جمعرات کا دن تھا، اس لیے فاضل مرتب نے "آدینہ" کو "پنجشنبہ" سے بدل دیا۔ اس طرح عیسوی تاریخ ۱۰ر نومبر ۱۸۲۸ء کی بجائے ۹ر نومبر ۱۸۱۸ء ہوگئی۔

(۳) "روزِ روانگیِ ایں قطعہ چہارم ربیع الاول روز یکشنبہ است۔" (ص ۴۹)

یہاں بھی اصل متن میں "دوشنبہ" تھا۔ تقویم سے مطابقت کی خاطر اسے بدل دیا گیا۔ حالانکہ غالب کے قلم کا یہ اندراج گزشتہ اقتباس میں درج اصل تاریخ "بست و نہم ربیع الاول، روز آدینہ" کے عین مطابق ہے اور ان دونوں تاریخوں کی رویت سے مطابقت پر دلالت کرتا ہے۔

(۴) "وآں ہفدہم یا ہیزدہم جمادی الاول بود و روز چہار شنبہ۔" (ص ۵۵)

مکتوب نمبر ۱۱ کے آخری حصے کے اس اندراج کا تعلق دراصل مکتوب نمبر ۱۰ سے ہے اور مکتوب نمبر ۱۰ میں ایک جگہ واضح طور پر "تا امروز کہ سہ شنبہ ہفدہم جمادی الاول است" (ص ص ۴۶ و ۴۷) مذکور ہے اور دوسری جگہ "تا امروز کہ ہفدہم یا ہیزدہم جمادی الاول است" (ص ۴۹) لکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو صحیح تاریخ یاد نہیں تھی لیکن یہ یاد تھا کہ اس روز منگل کا دن تھا۔ فاضل مرتب نے غالب کی تحریر کے اس اہم نکتے کو نظر انداز کر دیا اور منقولہ بالا اندراج میں "روز سہ شنبہ" کو "روز چہار شنبہ" سے بدل ڈالا حالانکہ اس تبدیلی کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا کیوں کہ تقویم کی رو سے بھی سہ شنبے کو جمادی الاول (۱۲۴۴ھ) کی سترھویں ہی تاریخ تھی۔

(۵) "ایں عریضہ بہ تاریخِ ششم شعبان روز چہار شنبہ رقم کردہ......" (۶۶)

یہاں بھی اصل متن میں "روز چہار شنبہ" کی بجائے "روز سہ شنبہ" درج ہے۔

(۶) "معروضہ ہفدہم فروری مطابق دوازدہم شعبان روز سہ

شنبہ۔'' (ص ۷۰)

یہاں ''ہفدہم فروری'' اور ''روز سہ شنبہ'' کی باہمی مطابقت کی بنا پر دن نہیں بدلا جاسکتا تھا، اس لیے قمری تاریخ بدل دی گئی ہے۔ غالب کی تحریر کی رو سے اسے ''دوازدہم شعبان'' کی بجائے ''سیزدہم شعبان'' ہونا چاہیے۔

(۷) 'امروز نہم محرم است۔' (ص ۸۱)

یہ اندراج مکتوب نمبر ۲۳ سے متعلق ہے۔ فاضل مرتب نے حاشیے میں اس کی وضاحت فرمادی ہے کہ اصل مخطوطے میں یہاں ''نہم'' کی بجائے ''ہشتم'' درج ہے۔ لیکن یہ تبدیلی جس مقام پر کی گئی ہے وہاں اس کے جواز کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا۔ البتہ مکتوب کے آخر میں تاریخِ تحریر ''نہم محرم روز شنبہ'' لکھی ہوئی ہے۔ (ص ۸۵) مگر اس کے ساتھ اصل متن سے انحراف کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔ اس بنیاد پر ایک عام قاری یہ قیاس کر سکتا ہے کہ خط کی اصل تاریخ یہی ہے اور اس سے قبل غالب نے بر بنائے سہو 'امروز نہم محرم است' کی بجائے 'امروز ہشتم محرم است'' لکھ دیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسبِ سابق یہاں بھی ''ہشتم'' کو ''نہم'' سے بدلا گیا ہے۔ خط کے وسط میں بھی ایک جگہ ''درعرضِ ایں ماہ کہ (از ہفتم) ذی الحجہ تا ہشتم محرم سپری شدہ' آیا ہے (ص ۸۳)۔ یہاں ''ہشتمِ محرم'' کو علیٰ حالہ برقرار رکھا گیا ہے۔

(۸) ''بہ روزِ آدینہ سیزدہم فروری چوں وقتِ برخاستنِ عملۂ صاحب سکرتر....' ص ۶۷ و ۶۸)

اس تاریخ کا معاملہ اگرچہ گزشتہ سطور میں مذکور دوسری تاریخوں سے قدرے مختلف ہے تاہم قابلِ لحاظ ضرور ہے۔ اصل مخطوطے میں یہاں تاریخ ''چہاردہم فروری'' درج تھی۔ چوں کہ تقویم کے مطابق ۱۸۲۹ء میں جمعے کے دن فروری کی تیرہ تاریخ تھی، اس لیے مرتب نے ''چہاردہم'' کو بدل کر ''سیزدہم'' بنادیا۔ یہاں غالب سے یقیناً سہو ہوا ہے اور فاضل مرتب کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے کہ جمعے کے دن فروری کی چودھویں نہیں، تیرھویں تاریخ تھی۔ اس کے باوجود متن میں یہ ترمیم احتیاط کے منافی ہے کیوں کہ غالب کی تحریر میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں جس کی بنیاد پر یہ طے کیا جاسکے کہ یہ واقعہ جمعے کے دن کا ہے یا فروری کی چودھویں تاریخ کا۔ اگر جمعے کے دن کا واقعہ ہے تو تاریخ یقیناً ۱۳ر فروری ہوگی اور اگر ۱۴ر فروری کا ہے تو دن سنیچر کا

ہوگا۔ اس صورت میں بہتر یہ ہوتا کہ متن کو اس کی اصل کے مطابق چھوڑ دیا جاتا اور حاشیے میں اس سہو کی صراحت کر دی جاتی۔ فاضل مرتب نے دو ممکنہ صورتوں میں سے ایک صورت کے حق میں حتمی فیصلہ کر کے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے۔

تدوینِ متن کا ایک مسلمہ اصول یہ بھی ہے کہ اگر اسما و اعلام کی کوئی مخصوص شکل مصنف کے مختارات میں شامل رہی ہے تو اسے تبدیل نہ کیا جائے۔ فاضل مرتب کا عمل اس کے برخلاف رہا ہے۔ مثلاً غالبؔ نے ایک انگریز افسر مسٹر بیلی کا تین بار ذکر کیا ہے (ص ص ۵۷ و ۶۰) اور تینوں جگہ ان کا نام ''جان بیلی'' لکھا ہے۔ مرتب نے اس کی جگہ ان کے اصل نام ''ولیم بیلی'' کو متن میں داخل کر کے حاشیے میں غالبؔ کی اس غلطی کی نشان دہی کر دی ہے۔ اسی طرح لفظ ''گورنر'' کے ساتھ ہر جگہ ''جنرل'' کا لاحقہ بھی فاضل مرتب کا اضافہ ہے، اگرچہ اسے قوسین کے اندر رکھا گیا ہے تاہم اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

متن کی تدوین و ترتیب میں ایک اہم مسئلہ املا کے تعین کا بھی ہوتا ہے۔ اس کی تین صورتیں ممکن ہیں۔ (۱) مخطوطے کا اصل املا برقرار رکھا جائے۔ (۲) اگر مرتب متن املا کے سلسلے میں مصنف کے مختارات و معمولات سے پوری طرح واقف ہے تو ان کا اتباع کرے۔ (۳) اصل املا سے صرفِ نظر کر کے رائج الوقت املا اختیار کر لیا جائے، بہ شرطے کہ اس تبدیلی سے کسی لفظ کا قدیم، علاقائی یا شخصی تلفظ متاثر نہ ہو۔ فاضل مرتب کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں مکمل آزادی سے کام لیا ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ غالبؔ فارسی میں ذالِ معجمہ کے وجود کے قائل نہیں تھے، چنانچہ ان کے اتباع میں ان تمام الفاظ کا املا جو اصل مخطوطے میں ذال سے لکھے گئے ہیں، زے سے بدل دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف انگریزی کے ان الفاظ کے معاملے میں جن کے املائے غالبؔ سے ہم اچھی طرح واقف ہیں، ان کی مخصوص روشِ تحریر کو اپنانے سے بھی احتراز کیا گیا ہے اور اس کے بدلے کے طور پر کسی ایک املا کی پابندی کی شرط بھی قائم نہیں رکھی گئی ہے۔ مثلاً اسی مجموعے میں صفحہ ۱۱۶ کے بالمقابل غالبؔ کی دستخطی ایک عرض داشت مورخہ ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کا عکس شامل ہے۔ اس میں انگریزی کے چار الفاظ (۱) لارڈ (۲) ریزیڈینٹ (۳) ریزیڈینسی

اور (۴) رپورٹ کا املا بہ طور خاص توجہ طلب ہے۔ غالبؔ نے ان چاروں لفظوں کو بالترتیب (۱) لاڑد (۲) رزیڈنٹ (۳) رزیڈنڈی اور (۴) رپوٹ (ٹے کی علامت کے طور پر چار نقطوں کے ساتھ) لکھا ہے۔ ان میں سے صرف آخری لفظ کو ان خطوط میں ہر جگہ اس کے اصل تلفظ کے مطابق ''رپورٹ'' لکھا گیا ہے۔ باقی تینوں لفظوں کے معاملے میں انتشار کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے جو افسوس ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ ''لارڈ'' کو چار جگہ ''لارڈ'' (ص ص ۶۰، ۶۱، ۸۶ و ۸۷) اور تین جگہ ''لارڈ'' (ص ص ۶۹، ۷۱ و ۷۲) لکھا گیا ہے۔ ''ریزیڈینٹ'' کی مختلف شکلیں حسب ذیل ہیں:

(۱) ریزیڈنٹ (رے زی ڈن ٹ): ص ۶۱ (صرف ایک بار)

(۲) رزیڈنٹ (رزی ڈن ٹ): ص ص ۳۱، ۳۸، ۴۷، ۴۸، ۵۴، ۶۱ (دو بار) ۷۴ و ۷۷ (نو بار)

(۳) رسیڈنٹ (رس ی ڈن ٹ): ص ص ۳۴ و ۷۶ (دو بار) تین بار

(۴) رسیدنٹ (رس ی دن ٹ): ص ص ۳۴ و ۷۶ (دو بار) (تین بار)

(۵) رسیدنت (رس ی دن ت): ص ص ۷۷ و ۹۲ (دو بار)

دلچسپ بات یہ ہے کہ صرف دو صفحے کے ایک ہی خط (نمبر ۱۷) میں یہ لفظ چار بار آیا ہے اور ان میں سے اولاً دو بار اسے ''رسیدنٹ'' (رس ی دن ٹ)، تیسری بار ''رزیڈنٹ'' (رزیڈنٹ'' (رز ی ڈ ن ٹ) اور چوتھی بار ''رسیدنت'' (رس ی دن ت) کی شکل میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اسی طرح مکتوب نمبر ۱۴ (ص ۶۱) میں ''رزیڈنٹ'' (رزی ڈ ن ٹ) اور ''ریزیڈنٹ'' (رے زی ڈن ٹ) کے درمیان صرف تین سطروں کا تفاوت ہے۔ اسی صفحے پر تیسری بار (سطر ۱۶) دوبارہ ''رزیڈنٹ'' (رزی ڈن ٹ) آیا ہے۔ یہاں ''ریزیڈنٹ'' (رے زی ڈن ٹ) اور ''رزیڈنٹ'' (رزی ڈن ٹ) کا درمیانی فاصلہ چھے سطروں کا ہے۔

''ریزیڈینسی'' کا املا بھی اسی خلفشار سے متاثر ہے۔ یہ لفظ اس مجموعۂ میں پانچ بار آیا ہے۔ ان میں سے تین بار اسے ''رسیدندسی'' (رس ی دن دس ی)، (ص ص ۳۴، ۳۵ و ۹۶) اور ایک ایک بار ''رسیدنٹی'' (رس ی دن ٹ ی)، (ص ۵۳) اور ''رسیدنسی'' (رس ی دن س ی)، (ص ۹۴) لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۹۶ کے اندراج ''رسیدندسی'' سے متعلق حاشیے میں یہ وضاحت بھی

موجود ہے کہ مخطوطے میں ''رسیدنٹی'' درج ہے۔

''باندا'' کا ذکر ان خطوط میں بار بار آیا ہے۔ اس کے املا کے معاملے میں بھی اسی قسم کی بے ضابطگی نظر آتی ہے۔ اسے کہیں الف کے ساتھ ''باندا'' اور کہیں ہائے مختفی کے ساتھ ''باندہ'' لکھا گیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۸۷ پر یہ لفظ دو بار آیا ہے۔ سطر نمبر ۱۱ میں اسے ''باندہ'' اور سطر نمبر ۲۰ میں ''باندا'' کی صورت میں قلمبند کیا گیا ہے۔ یہی کیفیت صفحہ نمبر ۹۲ کی سطر نمبر ۱۳ اور سطر نمبر ۱۶ میں بھی پائی جاتی ہے۔

مکتوب نمبر ۵ میں غالبؔ نے خط و کتابت کی غرض سے اپنا پتا لکھا تھا۔ مجموعے میں اس کا اندراج اس طرح ہوا ہے:

> ''شہر کلکتہ، قریب چیت بازار، در شملہ بازار نزدیک تالاب......'' (ص ۲۹)

مکتوب نمبر ۱۱ میں غالبؔ نے مولوی ولایت حسن کے توسط سے خط نہ بھیجنے کی تاکید کرتے ہوئے ایک بار پھر اس پتے کا اعادہ کیا ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ اس کی صورت حسب ذیل ہے:

> ''نشانِ شملہ بازار و گول تالاب و حویلی میر احمد کافی است۔'' (ص ۵۵)

اصل مخطوطے میں ان دونوں مقامات پر ''شملہ بازار'' کی بجائے واضح طور پر ''سملیا بازار'' لکھا ہوا ہے۔ مکتوب نمبر ۵، صفحہ ۲۹ کے حاشیے میں خود فاضل مرتب نے بھی اس کی نشاں دہی کر دی ہے لیکن اسے ''شملہ بازار'' کیوں لکھا گیا ہے، اس کی کوئی توضیح نہیں فرمائی ہے۔ یاد آتا ہے کہ بنگلہ زبان سے واقف کسی اہلِ علم نے ''سملیا'' کے معنی ''روئی'' بتائے ہیں۔ اگر یہ اطلاع درست ہے تو ''سملیا بازار'' کے معنی ''روئی کی منڈی'' قرار پائیں گے اور اسے کسی قرینے سے بھی ''شملہ بازار'' نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتبار سے یہ صریح تحریف ہے جس کی تدوین کے اصول و آداب میں کوئی گنجائش نہیں۔

تفہیم غالبؔ کی دشواریاں: فارسی خطوط کے حوالے سے

مشرقی ادبیات کے نگارخانے میں غالبؔ کی ذات ایک بتِ ہزار شیوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو مکمل توجہ کا طالب اور مفصل مطالعے کا مستحق ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، مورخ بھی ہیں اور لغت نویس بھی، اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کے مصور بھی ہیں اور مبصر بھی اور ان سب سے بڑھ کر اپنے نہاں خانۂ ذات کے صورت گر اور محتاط ترجمان بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کا دائرۂ عمل صرف اردو نظم و نثر تک محدود نہیں۔ ان کے دعووں پر یقین کیا جائے تو ان کے اصل جوہر فارسی میں کھلتے ہیں، جس سے وہ بہ قولِ خود بدوِ فطرت ہی سے ایک خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ فارسی نظم کی طرف باقاعدگی کے ساتھ اردو کی بہ نسبت خاصی تاخیر سے متوجہ ہوئے تاہم اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اپنے حجم اور تنوع کے اعتبار سے ان کا فارسی کلام اردو کلام کی بہ نسبت زیادہ وقیع اور مہتم بالشان ہے۔ علاوہ بریں ان کی جولاں گاہِ فکر کی وسعتوں سے آشنائی اور ان کی ذاتی زندگی سے متعلق بہت سے معاملات و مسائل کی تفہیم کے نقطۂ نظر سے نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ فارسی نثر میں اگرچہ اسلوب کی وہ جدت و ندرت اور شگفتگی و تازگی نظر نہیں آتی جو ان کی اردو نثر کا طرۂ امتیاز ہے لیکن اس خصوصیت کی بنا پر کہ مرزا صاحب کی تصنیفی و تالیفی زندگی کے بالکل ابتدائی دور سے عمر کے آخری بیس اکیس برس قبل تک یہ بلاشرکتِ

غیرے ان کی توجہ کا مرکز و محور رہی اور اس کے بعد بھی یہ تعلقِ خاطر کسی نہ کسی حد تک تادمِ آخر برقرار رہا، اسے کمتر درجے کی چیز تصور کرنا مناسب نہیں۔ غالب کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کارفرما عناصر، ان کی محرومیاں اور کامرانیاں، ان کے تجربات و مشاہدات، احباب اور معاصرین سے ان کے مراسم اور شعر و ادب کے بارے میں ان کے نظریات و تصورات جس افراط اور تفصیل کے ساتھ ان کی فارسی نثر میں جلوہ گر ہوئے ہیں اور یہ منتشر جلوے عمر کے جس بڑے حصے کا احاطہ کرتے ہیں، اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نثر ان کی شخصیت و سیرت کے مطالعے میں اہم ترین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کی تخلیقاتِ نظم و نثر کی بامعنی اور بامقصد تفہیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کی شخصیت کا ایک ایک گوشہ اور ان کے فرمودات کا ایک ایک پہلو پوری طرح روشن اور واضح نہ ہو۔ اس لیے اس نثر کا بہ نظرِ غائر جائزہ بے حد ضروری ہے۔ غالب کی فارسی نثر کے اس گنجینے کا سب سے اہم اور بیش قیمت سرمایہ ان کے وہ خطوط ہیں جو ''پنج آہنگ'' اور بعض دوسرے مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہاں انھی خطوط کی تفہیم میں حائل بعض دقتوں اور دشواریوں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

''پنج آہنگ'' کا پہلا ایڈیشن ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد غالب کی زندگی میں اپریل ۱۸۵۳ء اور جنوری ۱۸۶۸ء میں اس کے دو ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ جنوری ۱۸۶۸ء کا ایڈیشن ''کلیاتِ نثرِ غالب'' کے ایک حصے کے طور پر مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا۔ نول کشور پریس نے ۱۸۸۴ء تک اس کلیات کے کم از کم چار ایڈیشن اور شائع کیے۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی ایڈیشن شائع ہوا ہو لیکن ایسا کوئی نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ''پنج آہنگ'' کا آخری ایڈیشن جو ہمارے علم میں ہے، ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقعے پر مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس کی ترتیب و تدوین کے فرائض ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی نے انجام دیے تھے۔ باقی مجموعوں میں سے ''متفرقاتِ غالب'' مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۹ء میں دو بار، ''آثارِ غالب'' مرتبہ قاضی عبدالودود ۱۹۴۹ء، ۱۹۹۵ء اور ۲۰۰۰ء میں تین بار اور ''باغِ دو در'' مرتبہ پروفیسر وزیر الحسن عابدی و ''نامہ ہائے فارسیِ غالب'' مرتبہ سید اکبر علی ترمذی بالترتیب ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں ایک ایک بار شائع ہو چکے

ہیں۔ حیرت اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر اشاعتوں کا متن قابلِ اعتماد نہیں۔ اور یہی ان اشاعتوں کا وہ اہم ترین نقص ہے جو غالبؔ کے معدد بیانات کی تفہیم اور منشاے مصنف کے مطابق ان کی تعبیر وتشریح میں حارج ہے۔

''پنج آہنگ'' کے خطوط غالبؔ کی زندگی میں ان کی مرضی ومنشا کے مطابق اور نظر ثانی کے بعد شائع ہوئے تھے، اس لیے ان کے مکتوب الیہ متعین ہیں۔ اس مجموعے کے ایک سو انہتر (۱۶۹) خطوط میں سے صرف ایک خط ''بہ نام دوتن از فرزانگانِ پنجاب'' ایسا ہے کہ جس کے مکتوب الیہ نامشخص ہیں۔ ''باغِ دودر'' غالبؔ کی وفات سے صرف ڈیڑھ دو برس قبل ۱۲۸۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ اس کی بیشتر تحریریں خصوصاً حصۂ نثر کے مشمولات دوسروں کی فراہم کردہ ہیں۔ غالبؔ کے لیے اس زمانے میں ضعیفی اور مسلسل علالت کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان کی تسوید وترتیب پر پوری توجہ صرف کرسکیں۔ چنانچہ اس مجموعے کے ساٹھ (۶۰) خطوط میں سے دو خطوں کے مکتوب الیہ نامعلوم ہیں اور کم از کم دو خطوں کا انتساب صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ''متفرقات غالبؔ'' میں کل انچاس (۴۹) فارسی خط شامل ہیں۔ ان میں سے ایک کے علاوہ باقی تمام خطوط جس بیاض سے حاصل ہوئے تھے، اس میں معدودے چند مقامات کے علاوہ ایسی علامات اور اشارے مفقود ہیں جن کی بنیاد پر یہ متعین کیا جائے کہ کس خط کا مکتوب الیہ کون ہے۔ چنانچہ جہاں کوئی خارجی شہادت موجود نہیں، مرحوم مرتب نے اپنی صواب دید کے مطابق مکتوب الیہ کا تعین فرمادیا ہے۔ لیکن ان کا یہ فیصلہ کن شواہد پر مبنی ہے، اس کا کسی جگہ کوئی ذکر نہیں۔ اس غیر تحقیقی طریق کار کے نتیجے میں ان میں سے کم از کم دو خط یقینی طور پر غلط مکتوب الیہوں سے منسوب کردیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دو تین خطوں کا انتساب مشکوک ہے۔

''ماثرِ غالبؔ'' میں فارسی کے خطوط کی تعداد بتیس (۳۲) ہے۔ اصل بیاض میں ان کے مکتوب الیہ مشخص نہ تھے۔ قاضی صاحب نے مختلف داخلی وخارجی شواہد کی بنا پر چھبیس (۲۶) خط مرزا احمد بیگ تپاںؔ سے، ایک خط خواجہ فیض الدین حیدر شائقؔ سے، تین خط خواجہ محمد حسن سے اور ایک خط خواجہ محمد فخر اللہ سے منسوب کیا تھا۔ ایک خط کے بارے میں وہ کوئی فیصلہ نہ کرپائے تھے کہ یہ کس کے نام ہے۔ راقم السطور کو اس کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن کی ترتیب کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ اس ایک خط کے علاوہ کم سے کم تین خط اور ایسے ہیں جن کے مکتوب الیہم کے بارے

میں مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یعنی مجموعی طور پر اس مجموعے کے بتیس (۳۲) میں سے چار خطوں کے مکتوب الیہ نامشخص تھے۔

''نامہ ہائے فارسی غالب'' اکتیس (۳۱) خطوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ جس مخطوطے پر مبنی ہے، اس میں ایک کے علاوہ باقی تمام خط مکتوب الیہم سے متعلق کسی حوالے کے بغیر منقول ہیں۔ ترمذی صاحب کی تحقیق کے مطابق ان میں سے چوبیس (۲۴) خطوط کے مخاطب مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا ہیں۔ باقی چھ خطوں کے بارے میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ یہ کس کس کے نام ہیں۔ اندرونی شہادتیں اتنی مبہم ہیں کہ ان کی روشنی میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ کسی عہد ساز شخصیت کی نفسیات کے مطالعے، اس کے معمولات و مشاغل سے واقفیت، اس کی ترغیبات و ترجیحات کے تعین اور اس کے گرد و پیش سے محرمانہ باخبری میں جس قدر مدد اس کے خطوط سے ملتی ہے، کسی اور ذریعے سے نہیں ملتی۔ لیکن اس کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ خط کا مخاطب کون ہے اور اس کے ساتھ مکتوب نگار کے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ مکتوب الیہ کی شخصیت پردۂ خفا میں ہو تو بہت سے سربستہ راز معلوم ہو جانے کے باوجود نامعلوم رہتے ہیں۔ کسی بھی قابلِ ذکر شخص سے متعلق کسی نئے واقعے کا علم یقیناً ہماری معلومات میں اضافے کا سبب بنتا ہے لیکن یہ علم ناقص ہے، اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے محرکات کیا تھے اور اسے انجام دینے میں کس شخص نے کیا کردار ادا کیا۔ خطوط سے استفادے کے دوران مکتوب الیہ کے نامعلوم یا مشتبہ ہونے کی بنا پر اس قسم کی صورتِ حال اکثر فیصلہ کن نتائج تک پہنچنے میں سدِ راہ بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر صرف ''آثرِ غالب'' کے ایک خط کا حوالہ کافی ہوگا۔ قاضی صاحب کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق یہ اس مجموعے کا چوبیسواں خط ہے اور مرزا احمد بیگ تپاں کے نام ہے۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے ایک ''مجموعۂ نثر'' ترتیب دیا تھا، جس میں غالب کے کلام پر کلکتے کے مشاعروں کے دوران عائد کردہ تمام اعتراضات یکجا کر دیے گئے تھے۔ ان میں سے بعض اعتراض ان تحریفات پر مبنی تھے جن کے ذریعے مرتب نے بعض اشعار کی صورت بالارادہ مسخ کر دی تھی۔ لیکن خارجی یا داخلی طور پر ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ مرزا افضل بیگ اور مولوی سراج الدین احمد کے ساتھ تپاں بھی غالب کی فضیحت و رسوائی

کے لیے تیار کردہ اس سازش میں شریک تھے۔ اس کے برخلاف ان کے اور غالبؔ کے درمیان دوستانہ اور مخلصانہ روابط کی شہادتیں تسلسل کے ساتھ موجود ہیں، اس لیے ان کی طرف اس ''مجموعۂ نثر'' کی نسبت کسی بھی درجے میں قابلِ قبول نہیں۔ راقم السطور کے نزدیک اس خط کے مخاطَب ''جناب مرزا صاحب، والا مناقب، ستودہ شیم، مجمعِ لطف و کرم'' سے دراصل مرزا افضل بیگ مراد ہیں جو در پردہ اس ہنگامہ آرائی کی قیادت کر رہے تھے۔ اِانتساب کی اس تبدیلی کے بعد اس خط کے تمام مضمرات از خود واضح ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک عام قاری، ناقد یا سوانح نگار کے لیے یہ قطعاً ممکن نہیں کہ وہ پہلے پورے حزم و احتیاط کے ساتھ ہر خط کے مکتوب الیہ کا تعین کرے، بعد ازاں اس کے مندرجات سے وہ نتائج نکالے جو صورتِ واقعہ کے عین مطابق ہوں۔

دوسرا اہم مسئلہ جو ان خطوط کے مطالعے کے دوران سامنے آتا ہے اور ان سے استنباطِ نتائج میں دشواریاں پیدا کرتا ہے، وہ ان کی خارجی وحدت و سلیت کے تیقّن کا ہے۔ خط سے ذاتی نوعیت کی وہ مخصوص تحریر عبارت ہوتی ہے جو ایک خاص وقت پر اور بالعموم کسی خاص ماحول یا پس منظر میں لکھی جاتی ہے اس لیے اس کے معاملے میں یہ بات دوسری تحریروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ خارجی و داخلی دونوں سطحوں پر الحاق و تصرف سے پاک ہو۔ خارجی سطح پر الحاق یا تصرف سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو کاتب یا ناقل کی غلطی یا کسی اور وجہ سے کسی دوسرے خط کا کوئی حصہ اس میں شامل ہو گیا ہو اور نہ ایک خط نے منقسم ہو کر دو خطوں کی شکل اختیار کر لی ہو۔ جہاں تک ایک خط کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کا تعلق ہے، غالبؔ کے ان خطوں میں واضح طور پر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، لیکن دو خطوں کے باہم مخلوط ہو جانے کی کئی مثالیں موجود ہیں مثلاً ''پنج آہنگ'' کا خط نمبر ۶۰ موسومہ مولوی سراج الدین احمد جو ''کلیاتِ نثرِ غالبؔ'' مطبوعہ ۱۸۷۱ء کے صفحہ نمبر ۱۴۷ کی سطر نمبر ۱۹ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۱۴۹ کی دوسری سطر پر ختم ہوتا ہے، بہ تفصیلِ ذیل دو ایسے خطوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ایک ناقص الآخر اور دوسرا ناقص الاوّل ہے۔

اس خط کا ابتدائی حصہ جو ''مخلص نوازا، عمرہاست کہ بہ ورودِ دل نواز نامہ جانے تازہ نہ یافتہ ام'' سے شروع ہو کر اگلے صفحے کی تیسری سطر میں ''کس بشنود یا نشنود من گفتگوے می کنم'' پر ختم ہوتا ہے، جس مستقل خط سے متعلق ہے، اس کا باقی حصہ ''متفرقاتِ غالبؔ'' کے خط نمبر ۲۱ میں

ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ''گفتگوے می کنم'' کے فوراً بعد ''روزِ شانزدہم از مئی بود'' سے ایک نیا خط شروع ہو جاتا ہے۔ ''متفرقات'' کے مطابق اس کی ابتدا ''ملاذا، مُطاعا'' سے ہونا چاہیے۔ بہ ظاہر تخاطب کے لیے مخصوص ان دو الفاظ کے علاوہ اس کا کوئی اور حصہ ضائع نہیں ہوا ہے۔

''متفرقاتِ غالبؔ'' کا خط نمبر ۱۳ بہ نام مولوی سراج الدین احمد بھی دو ایسے خطوں کے نامکمل اجزا پر مشتمل معلوم ہوتا ہے جن میں سے پہلے خط کی آخری چند سطریں اور دوسرے خط کے شروع کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ اس خط کے آغاز میں مکتوب الیہ کے بخیریت کلکتے پہنچ جانے کی اطلاع پر اس طرح اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے:

> ''قبلۂ من! تا شنودم کہ بہ کلکتہ رسیدید، خداے را شکر گفتم و سپاسِ ایزدی بجا آوردم''

لیکن آخر کے یہ دو تین جملے جن پر اس خط کا اختتام ہوا ہے، اس سے بالکل مختلف بلکہ برعکس صورتِ حال کی نشان دہی کرتے ہیں:

> ''خدارا اگر بہ کان پور رسیدہ و بہ عشرت کدۂ خویش آرمیدہ اید، حالِ کلکتہ مفصل برنگارید، والسلام''

ظاہر ہے کہ خط کے آغاز میں کلکتے پہنچ جانے کی اطلاع پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد آخر میں یہ سوال کرنا کہ اگر آپ کان پور پہنچ گئے ہوں تو کلکتے کا حال لکھیے، بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ آخری حصہ کسی دوسرے خط سے متعلق ہے۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط حصۂ اول پر مشتمل ناقص الآخر خط سے پہلے لکھا گیا ہوگا۔

''پنج آہنگ''، ''متفرقاتِ غالبؔ'' اور ''نامہ ہاے فارسیِ غالبؔ'' میں اور بھی کئی ایسے خطوط موجود ہیں جن میں انتشارِ متن کی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر نہ تو کسی اندرونی شہادت کی بنا پر حتماً ان کے زمانۂ تحریر کا تعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے حوالے سے واقعات کے ربطِ باہمی کے سلسلے میں کوئی ایسی رائے قائم کی جا سکتی ہے جو پوری طرح باوثوق اور قابلِ اعتماد ہو۔

ایک اور پریشان کن صورتِ حال جس سے ان خطوط کے مطالعے کے وقت سابقہ پڑتا

ہے، ان کے متن کے وہ داخلی نقائص ہیں جو بہ آسانی ہر محقق یا ناقد کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔ ایک سے زائد اور بعض اوقات تین یا چار بلکہ اس سے بھی زیادہ اشاعتوں نے جہاں علم و ادب کے شیدائیوں کے درمیان ان خطوں کی قدر و منزلت میں مسلسل اضافے پر مہر تصدیق ثبت کی ہے اور ان سے استفادے کے دائرے کو وسیع تر کیا ہے، وہیں ہر تازہ اشاعت کے ساتھ تصحیف و تحریف کی شگوفہ کاریوں کے تناسب میں اضافہ کر کے صحت متن پر ضرب کاری لگانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ الفاظ کے اس معمولی الٹ پھیر کا ادراک اور اس کے مضمرات کا عرفان بجائے خود ایک مشکل کام ہے، اس پر مستزاد یہ کہ ہماری زود اعتقادی اور سہل پسندی ہمیں اس قسم کی موشگافیوں میں الجھنے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ان خطوط کے حوالے مسائل کو سلجھانے کی بجائے مزید الجھا دیتے ہیں۔ وضاحت کے لیے صرف دو مثالیں کافی ہوں گی:

''پنج آہنگ'' کے مکتوب نمبر ۸۶ موسومہ منشی محمد حسن میں غالب کا بیان ہے کہ:

''امروز کہ چارشنبہ ہیز دہم ماہِ ترسایان است و شبے کہ بہ قاعدۂ اہل تنجیم شب چارشنبہ و بہ لسانِ شرع شب پنجشنبہ نامیدہ شود، رسیدہ۔''

اس خط میں غالب نے راجا صاحب رام کے وکیل کے توسط سے سبحان علی خان کے نام ایک خط، ''حضور والاے حضرت وزارت پناہی'' میں پیش کرنے کے لیے ایک عرضداشت اور ایک ''قصیدۂ مدحیۂ شاہ'' کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ مختلف داخلی و خارجی شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خط نصیر الدین حیدر (متوفی ۷ر جولائی ۱۸۳۷ء) کے آخری زمانۂ حکومت میں چارشنبہ، ۱۸ر جنوری ۱۸۳۷ء کو لکھا گیا تھا، لیکن ''پنج آہنگ'' کے بعد کے تمام ایڈیشنوں میں سہوِ کتابت کی بنا پر ''ہیز دہم ماہِ ترسایاں'' نے ''سیز دہم ماہِ ترسایاں'' کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تحریف شدہ متن کے مطابق ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی نے اس خط کی تاریخ تحریر چارشنبہ، ۱۳ر ستمبر ۱۸۲۶ء متعین کی ہے اور کاظم علی خاں نے ان کے اس فیصلے کی روشنی میں سبحان علی خاں کو بھیجی ہوئی عرضداشت کو روشن الدولہ کی بجائے آغا میر سے اور قصیدۂ مدحیہ کو نصیر الدین حیدر کی بجائے غازی الدین حیدر سے منسوب کر دیا ہے۔[۳] اس خلطِ مبحث نے دربار اودھ سے غالب کی تعلقات کے سلسلے میں جو

غلط فہمیاں پیدا کی ہیں، ان کا تجزیہ وتصفیہ بجائے خود ایک دلچسپ موضوع بحث بن سکتا ہے۔

مکتوب نمبر ۱۱۸ موسومہ مظفر حسین خاں کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی کاتبوں کے دخلِ بے جا کی اسی کرشمہ کاری کا نمونہ پیش کرتا ہے:

''بہ زبانِ دل زبابیانِ مشفقی اعتماد الدّولہ شنیدہ شد کہ دراں نامہ کہ از کلکتہ بداں والا مقام نبشتہ اند، بہ من کہ از؛ عاگو یانم، نیز سلام نبشتہ اند۔''

اس عبارت کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اعتماد الدولہ غالبؔ کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور اس خط کی تحریر کے وقت یا اس سے کچھ پہلے دہلی میں موجود تھے۔ غالبؔ کے حلقۂ تعارف میں ''اعتماد الدّولہ'' کے خطاب سے معروف صرف دو اشخاص کے نام ملتے ہیں۔ ان میں پہلا نام غالبؔ کے دوست نواب حامد علی خاں کے ماموں اور خسر میر فضل علی خاں کا ہے۔[۴] میر فضلِ علی کا اصل وطن موجودہ ہریانہ کے ضلع پانی پت کا ایک چھوٹا سا قصبہ برست تھا لیکن ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ وہاں وہ ترقی کی مختلف منازل طے کرتے ہوئے نصیر الدین حیدر کے عہد (۲۰؍اکتوبر ۱۸۲۷ء تا ۷؍جولائی ۱۸۳۷ء) میں وزارت کے منصب تک پہنچے، لیکن بر بنائے ناکامی صرف نو مہینے کے بعد برطرف کر دیے گئے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ غالبؔ نے ان کی وفات پر ایک قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا جو ان کے کلیاتِ فارسی میں موجود ہے۔[۵] لیکن اوّلاً تو غالبؔ سے ان کے براہِ راست اور بے تکلفانہ روابط کا کوئی ثبوت موجود نہیں، ثانیاً زیرِ بحث خط کا زمانۂ تحریر ان کے سالِ وفات سے کافی موخر ہے، اس لیے یہ ان کا ذکر نہیں ہو سکتا۔ ''اعتماد الدّولہ'' سے مخاطب اس دور کی دوسری معروف شخصیت غالبؔ کے مذکور الصدر دوست نواب حامد علی خاں تھے، جنھیں یہ خطاب غالباً بہ طورِ وراثت حاصل ہوا تھا۔ لیکن اس خط میں ان کا ذکر اس لیے خارج از امکان معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کے ہاں یا کسی اور معاصر تحریر میں ان کے اور مظفر حسین خاں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ''اعتماد الدولہ'' دراصل تصحیف ہے ''اعتقاد الدولہ'' کی اور اعتقاد الدولہ'' خطاب تھا نوروز علی خاں کا جو کان پور کے رہنے والے تھے اور سلطنتِ اودھ میں کافی رسوخ رکھتے تھے۔ ''باغِ دودر'' میں

شامل جواہر سنگھ جوہر کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۴۵ء کے اوائل میں دہلی آئے تھے اور غالب سے ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔[۶] مظفر حسین خاں اعتقاد الدولہ کے دوستانِ دیریں میں سے تھے۔ اسی وسیلے سے غالب کو مظفر حسین خاں سے تعارف کا شرف حاصل ہوا اور باہم مراسلت کی راہ ہموار ہوئی۔ خط نمبر ۱۰۹ میں جو اس خط کے بعد کی تحریر ہے، اسی سلسلۂ دوستی کے قیام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دلِ غم زدہ داشتم کہ اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں بردو پنہاں از من بہ یکے از دیریں دوستانِ خویش سپرد''۔

''پنج آہنگ'' طبعِ اول اور ''کلیاتِ نثرِ غالب'' طبعِ اول اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ ''پنج آہنگ'' طبعِ ثانی میں زیرِ بحث خط نمبر ۱۱۸ کی منقولۂ بالا عبارت میں منشائے مصنف کے عین مطابق ''اعتقاد الدولہ'' ہی لکھا ہوا ہے۔ بعد ازاں ''کلیاتِ نثر'' کی اشاعتِ ثانی سے ''پنج آہنگ'' مرتبہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی تک تمام ایڈیشنوں میں تواتر کے ساتھ ''اعتماد الدولہ'' نقل ہوتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محمد عمر مہاجر اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے ترجموں میں بھی اسی روایت کا اتباع کیا گیا ہے۔ چونکہ ''پنج آہنگ'' طبعِ اول اور طبعِ ثانی اور ''کلیاتِ نثرِ غالب'' کے نسخے عام طور پر دستیاب نہیں، اس لیے محققین و ناقدینِ غالب عام طور پر بعد کے ان ایڈیشنوں اور ترجموں ہی کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں اور تیز رفتار ترقی کے موجودہ دور کے تقاضے ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کسی تحریر کے مضمرات کو پوری طرح سمجھنے یا کسی واقعے کی تہ تک پہنچنے کے لیے ایک ایک جملے بلکہ ایک ایک لفظ پر اس طرح غور کیا جائے کہ کسی غلط فہمی یا غلط بیانی کا امکان باقی نہ رہے، اس لیے ان غیر معتبر ایڈیشنوں کے حوالے سے کہی ہوئی کسی بھی بات کو شرحِ صدر کے ساتھ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور دقت جو بعض وقت اوقات ان خطوط کی تفہیم کو عقدۂ لاینحل بنا دیتی ہے، یہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ تاریخوں کے التزام سے عاری ہے۔ ایسا نہ تھا کہ خطوط کے ساتھ تاریخ لکھنا غالب کا معمول نہ ہو لیکن اس معاملے میں وہ کسی خاص اصول یا ضابطے کے پابند نہ تھے۔ کبھی خط کے شروع میں، کبھی درمیان میں، کبھی آخر میں اور کبھی لفافے کے اوپر دن، تاریخ اور مہینا ضرور لکھ

دیا کرتے تھے، البتہ سال کا لکھنا لازمی یا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ جب اشاعت کے لیے مکاتیب کی ترتیب کا سلسلہ شروع ہوا اور مکتوب الیہم سے ان کی نقلیں حاصل کی گئیں تو کسی تخصیص کے بغیر کہیں ان تفصیلات کو باقی رکھا گیا اور کہیں غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ خطوط صرف انشا اور ادب عالیہ کے نمونوں کے طور پر یکجا کیے گئے تھے۔ انھیں کسی تاریخی دستاویز یا سوانحی ماخذ کی حیثیت سے پیش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اس کے برخلاف آج یہ خطوط ادب وانشا کے نمونوں سے کہیں زیادہ غالبؔ اور ان کے عہد کے تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی ماخذ کے طور پر قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے تاریخوں کی غیر موجودگی واماندگانِ تحقیق کو بار بار کفِ افسوس ملنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ یہ مسئلہ کس قدر اہم ہے اور اس کی وجہ سے تفہیم غالبؔ میں کیا کیا دشواریاں پیش آتی رہتی ہیں، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے کیا جا سکتا ہے:

''پنج آہنگ'' کا خط نمبر ۷ حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے غالبؔ سے ان کی نثر کے چند نمونے طلب کیے تھے جس کے جواب میں انھوں نے ''دیوانِ ریختہ'' کا دیباچہ اور ''گلِ رعنا'' کے مقدمے اور خاتمے کی نثریں ان کی خدمت میں ارسال کرتے ہوئے یہ خط لکھا تھا۔ خط کے آغاز میں غالبؔ نے اس بات پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ ''طول زمانِ فراق'' کے باوجود ان کی ''بے اعتباری'' کا ''نقش'' بہ دستور ''صفحۂ خاطر احباب'' پر ثبت تھا۔ مولانا حالیؔ کا بیان ہے کہ یہ خط کلکتے سے لکھا گیا تھا۔[۷] غالبؔ ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے اور وہاں ان کا قیام ۱۴ر اگست ۱۸۲۹ء تک رہا تھا۔[۸] اس اعتبار سے اس خط کو فروری ۱۸۲۸ء سے اگست ۱۸۲۹ء کی درمیانی مدت کی تحریر ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جو نثریں اس کے ساتھ بھیجی گئی تھیں وہ بھی اسی زمانے میں یا اس سے پہلے لکھی گئی ہوں گی اور ''دیوانِ ریختہ'' کا وہ نسخہ بھی جس کا دیباچہ حکیم صاحب کو بھیجا گیا تھا، مرتب ہو چکا ہوگا۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے جب ''دیوانِ غالبؔ'' کی تدوین کا کام شروع کیا تو انھیں ایک ایسا قلمی نسخہ بھی ملا جس میں دیباچے کے خاتمے پر اس کی تاریخ تحریر ۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ درج تھی جو از روے تقویم ۱۴ر مئی ۱۸۳۳ء کے مطابق ہے۔ اس دریافت کی روشنی میں عرشی صاحب نے یہ راے قائم کی کہ ہمیں خواجہ صاحب (حالیؔ) کے بیان کو نظری قرار دے کر تاریخ انتخاب دیوان کو مذکورہ تاریخ (۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ) سے کچھ پہلے ماننا پڑے گا۔''[۹] اس سے ضمناً یہ نتیجہ نکلا کہ ''دیوانِ غالبؔ

''کا متداول نسخہ غالب کی کلکتے سے واپسی (۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء) کے تقریباً ساڑھے تین سال بعد مرتب ہوا تھا اور احسن اللہ خاں کے نام کا زیرِ بحث خط اس سے بھی بعد کی تحریر ہے۔ مالک رام صاحب نے جب اس دیوان (نسخۂ عرشی) کی اشاعتِ اول (۱۹۵۸ء) پر تبصرہ تحریر فرمایا ۱۰ تو مولانا حالی کی تحریر کو فوقیت دیتے ہوئے ان تمام نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنے اس اختلاف رائے کی تائید میں انھوں نے جو دلیلیں پیش فرمائیں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) جس زمانے میں حکیم احسن اللہ خاں نے غالب سے ان کی نثریں طلب کی ہیں، وہ دلی میں نہیں تھے، کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اگر دلی میں ہوتے تو حکیم صاحب خط لکھنے کی بجائے ذاتی طور پر ان سے مل کر مطالبہ کر سکتے تھے۔

(۲) مرزا صاحب کو دلی سے باہر گئے ہوئے کافی مدت گزر چکی تھی۔

(۳) اگر یہ خط ۱۸۳۳ء کے بعد کا ہے تو بتایا جائے کہ وہ کب دلی سے اتنی مدت کے لیے باہر گئے کہ اس پر ''طولِ زمانِ فراق'' کا اطلاق ہو سکے۔

چونکہ یہ دلائل کافی مضبوط تھے اور بہ ظاہر ان سے اختلاف کی گنجائش نہ تھی، اس لیے آخر میں انھوں نے بلا تامل یہ اعلان بھی فرما دیا:

''غرض ہر طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا نے یہ خط حکیم احسن اللہ خاں کو کلکتے سے لکھا تھا اور اس بارے میں حالی کی شہادت درست ہے۔''

حالی کی شہادت کو درست مان لینے کے بعد جن امور کا فیصلہ ناگزیر تھا، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس خط سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ میرزا نے سفرِ کلکتہ کے دوران میں نہ صرف سفینۂ ''گل رعنا'' مرتب کیا اور اس کے لیے فارسی میں دیباچے اور خاتمے کی عبارتیں قلمبند کیں، بلکہ جب تک وہ دیوانِ ریختہ کا دیباچہ بھی لکھ چکے تھے۔ اس سے منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ اگر دیباچہ لکھا جا چکا تھا تو دیوان کا انتخاب بھی ہو چکا تھا، اور میرے

نزدیک اس نتیجے کے تسلیم کر لینے میں کوئی اشکال نہیں۔"

اس تبصرے کے جواب [11] میں عرشی صاحب نے یہ بات تو بہ دلائل ثابت فرمادی کہ "گلِ رعنا" کے لیے اردو کے اشعار انتخاب کرتے وقت جو نسخۂ دیوان غالب کے پیشِ نظر تھا، وہ متداول "دیوانِ غالب" سے مختلف تھا۔ بہ الفاظِ دیگر متداول دیوان کی ترتیب بعد میں عمل میں آئی ہے۔ لیکن خط کے زمانۂ تحریر سے متعلق مالک رام صاحب کی تنقیحات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ جب "نسخۂ عرشی" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا (۱۹۸۲ء) تو انھوں نے درمیان کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اس مسئلے کو اس طرح حل کرنے کی کوشش فرمائی:

> "دیباچے کے مندرجات میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو متداول انتخاب کے ساتھ مخصوص ہو...... اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دیباچہ اولاً نسخۂ شیرانی یا اس کے ہم زاد نسخے کے لیے لکھا گیا تھا اور کلکتے ہی میں لکھا گیا تھا۔ جب دہلی میں متداول انتخاب عمل میں آیا تو اس پر بھی اس دیباچے کے مندرجات صادق آتے تھے، اس لیے میرزا صاحب نے اس میں کوئی تبدل و تغیر نہ کیا، صرف تاریخ بدل دی یا اس میں تاریخ نہ تھی تو اس کا اضافہ کر دیا۔" [12]

یہ انتہائی عبرت خیز بحث ہے جس پر اردو کے دو بڑے محققین نے اپنا کافی وقت ضائع کیا اور جس سے بے حد گمراہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ اور اس تمام تضیعِ اوقات کا منبع اس خط کا یہ بہت چھوٹا سا مگر نہایت اہم نقص تھا کہ اس پر تاریخ درج نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب نے یہ خط ۱۸۳۴ء کے اواخر یا ۱۸۳۵ء کے اوائل میں یعنی کلکتے سے واپسی کے کم و بیش پانچ سال کے بعد لکھا تھا۔ وہ اس وقت دہلی میں موجود تھے لیکن حکیم احسن اللہ خاں دہلی سے باہر جھجر میں نواب فیض محمد خاں کے طبیب خاص کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس سے قبل وہ نواب احمد بخش خاں کی سرکار سے وابستہ تھے۔ احمد بخش خاں کا انتقال ۱۸۲۷ء میں اس وقت ہوا تھا جب کہ غالب کلکتے کے راستے میں تھے۔ ان کی وفات کے فوراً بعد نواب فیض محمد خاں نے حکیم صاحب کو اپنے پاس بلا لیا۔ خط میں جس "مدتِ فراق" کو "مدِ طولِ زماں" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے یہی طویل

زمانۂ ملازمت مراد ہے۔[۱۳]

ایسا ہی ایک اور خط جو ایک زمانے تک غالب شناسوں کے درمیان موضوع بحث رہا ہے، ''گلِ رعنا'' کے خاتمے میں شامل ہے۔ یہ صنعتِ تعطیل میں ہے اور فیروز پور سے مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے نام لکھا گیا تھا۔ خاتمۂ ''گلِ رعنا'' کے علاوہ غالب نے اسے مولوی محمد علی خاں صدر امینِ باندا کے نام ایک خط میں بھی ایک اور ''مسودۂ نثر'' کے ساتھ اپنی انشا کے نمونے کے طور پر نقل کیا ہے۔ فیروز پور کا یہ سفر غالب نے اپنی خاندانی پنشن کی غلط تقسیم کے سلسلے میں اپنی شکایات براہِ راست نواب احمد بخش خاں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کیا تھا۔ ''گلِ رعنا'' کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اس سفر سے دہلی واپس چلے آئے تھے اور ایک لمبی مدت وہاں گزارنے کے بعد کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ یہ روداد انھوں نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ''چوں سر رشتۂ ہر کار بہ زمانے باز بستہ است، دراں کشاکش از بند بدر نہ توانم جست۔ بے خودی گریبانم گرفت و بازم بہ دہلی آورد۔ (چوں) روزگارے دراز بہ خاک نشینی سپری شد...... پاے خوابیدہ (باز) بہ رفتار آمد...... ہر چند مرا بایستے بہ کلکتہ رسید...... اما از انجا کہ عنانِ جنبشِ ذراتِ کائنات بہ کفِ اضطرار سپردہ اند...... نخست اتفاقِ ورود بہ لکھنؤ افتاد۔''[۱۴]

مولوی محمد علی خاں کے نام کے خط میں اس خط کی شانِ نزول ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

> ''در مبادیِ بسیجِ سفرِ مشرق بہ فیروز پور بہ خدمتِ عمِ ممدوح (نواب احمد بخش خاں) گزرانیدہ بودم۔ فخر العلما مولوی محمد فضلِ حق نام دوستے در دار الخلافت تمکن داشت کہ من از فرطِ استعجال فرصتِ تودیع نیافتہ (وازو) پدرود ناشدہ بہ منزلِ مقصود شتافتہ بودم، درانجا رسیدہ

پوزش نامہ بہ خدمت کثیر الافادتش نگاشتم۔''۱۵؎

اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط جس سفر کے زمانے میں لکھا گیا ہے، وہ ''درمبادیِ بسیچ سفرِ مشرق''، یعنی سفرِ کلکتہ کے لیے آمادگی کے ابتدائی دنوں میں پیش آیا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر فیروز پور اس کی منزلِ اوّل اور کلکتہ منزلِ آخر تھا۔ ایک اور موقعے پر بھی غالبؔ نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ وہ فیروز پور پہنچنے کے بعد قرض خواہوں کے خوف سے دہلی واپس نہ جا سکے اور کانپور، لکھنؤ اور باندا ہوتے ہوئے کلکتے پہنچ گئے۔۱۶؎ بیانات کے اس فرق کی وجہ سے جو خلطِ مبحث پیدا ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کلکتے کے لیے روانگی کے سلسلے میں غالبؔ کے پہلے بھرت پور اور اس کے بعد فیروز پور پہنچنے کا زمانہ تو معلوم ہے لیکن اس خط کا زمانہ تحریر معلوم نہیں، اس لیے یہ طے کرنا دشوار ہے کہ یہ خط اسی معلوم سفر سے متعلق ہے یا کسی اور سفر سے تعلق رکھتا ہے۔

اس بحث میں جن اربابِ علم نے حصہ لیا، ان میں شیخ محمد اکرام، مالک رام صاحب، سید اکبر علی ترمذی، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر ابو محمد سحرؔ اور جناب کالی داس گپتا رضاؔ بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ محمد اکرام اور پروفیسر ابو محمد سحرؔ کے مطابق سفرِ کلکتہ سے قبل غالبؔ صرف ایک بار فیروز پور گئے، فیروز پور سے وہ دہلی واپس آئے اور کچھ دنوں کے بعد وہاں سے براہِ راست کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے۔۱۷؎ پروفیسر محمود الٰہی نے مختلف شواہد کی روشنی میں یہ رائے قائم کی کہ غالبؔ نے فیروز پور کے ایک سے زائد سفر کیے۔ جس سفر سے وہ دہلی واپس آئے تھے، وہ دہلی سے فیروز پور ہوتے ہوئے کلکتے جانے والے سفر سے پہلے کا واقعہ ہے۔۱۸؎ مالک رام صاحب کا شروع میں یہ خیال تھا کہ غالبؔ ایک بار جو دہلی سے نکلے تو احمد بخش خاں سے ملاقات کے بعد وہیں سے کلکتے روانہ ہو گئے۔ ۱۹۶۹ء میں انھوں نے اپنے اس موقف سے رجوع کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی کہ وہ مولوی فضلِ حق سے ملاقات کی غرض سے دہلی واپس آئے، اس کے بعد یہیں سے کلکتے چلے گئے۔ ۱۹۷۶ء میں موصوف نے ایک بار پھر اپنی رائے بدلی اور پہلے موقف کی طرف لوٹ گئے۔ ۱۹؎ ترمذی صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ غالبؔ فیروز پور میں نواب احمد بخش سے ملاقات کے بعد دہلی واپس جانے کی ہمت نہ کر سکے اور وہیں سے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے۔۲۰؎ پروفیسر محمود الٰہی کی طرح جناب کالی داس گپتا رضاؔ بھی غالبؔ کے کم از کم دو بار فیروز پور جانے کے قائل ہیں۔ ان

کے مطابق غالب نے ان میں سے پہلا سفر جون ۱۸۲۵ء میں کیا تھا۔ دوبارہ وہ ۱۸ دسمبر ۱۸۲۵ء کے بعد بھرت پور سے فیروز پور پہنچے تھے۔[۲۱] ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ شیخ محمد اکرام، جناب مالک رام، جناب اکبر علی ترمذی اور پروفیسر ابو محمد سحر کے نزدیک غالب کا سفرِ کلکتہ سے قبل صرف ایک بار فیروز پور جانا ثابت ہے اور چونکہ اس سفر کے دوران غالب ۱۸ دسمبر ۱۸۲۵ء کے بعد کسی روز بھرت پور سے فیروز پور پہنچے تھے، اس لیے زیرِ بحث خط کو لازماً دسمبر ۱۸۲۵ء کے تیسرے عشرے کی تحریر ہونا چاہیے۔ محمود الٰہی صاحب کا فیصلہ یہ ہے کہ غالب ایک سے زائد بار فیروز پور گئے اور جس سفر سے وہ دہلی واپس آئے تھے وہ براہِ فیروز پور کلکتے جانے والے سفر سے پہلے پیش آیا تھا۔ مولوی فضلِ حق کے نام خط اسی سفر کے دوران لکھا گیا تھا لیکن یہ سفر کس زمانے میں پیش آیا، یہ معما وہ بھی حل نہ کر سکے۔ رضا صاحب نے اس پہلے سفر کا زمانہ جون ۱۸۲۵ء قرار دیا ہے اس سے ضمناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ خط ۱۸۲۵ء کے اسی مہینے میں لکھا گیا ہوگا۔ لیکن ان تمام موشگافیوں اور قیاس آرائیوں کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ فی الواقع اس خط کا زمانۂ تحریر کیا ہے اور چونکہ زمانۂ تحریر نامعلوم ہے، اس لیے نہ تو اس خط کے حوالے سے غالب کے صرف ایک بار فیروز پور جانے کا دعویٰ کرنے والے محققین کے بیانات کی مدلل طور پر تردید کی جا سکتی ہے اور نہ ان حضرات کی رائے سے پورے وثوق کے ساتھ اتفاق کیا جا سکتا ہے جو اسے ان کے ایک سے زائد سفروں میں سے پہلے سفر سے متعلق قرار دیتے ہیں۔

بعض داخلی شہادتوں اور مستند تاریخی حوالوں کی روشنی میں راقم السطور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ خط ستمبر ۱۸۲۳ء کے کچھ دنوں بعد لکھا گیا تھا۔[۲۲] براہِ بھرت پور، فیروز پور غالب کے سفرِ کلکتہ کا آغاز اس پر دو برس سے کچھ زائد مدت گزر جانے کے بعد نومبر ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اس پس منظر میں غالب کا یہ بیان بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس متنازعہ فیہ سفر سے واپسی کے بعد "روزگارے دراز" تک دہلی میں "خاک نشیں" رہ کر کلکتے کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ سفر کے لیے آمادگی اور سفر پر روانگی کے درمیان جو نازک فرق ہے، اسے ملحوظ رکھا جائے تو غالب کے اس بیان کو بھی خلافِ واقعہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ انھوں نے یہ خط "درمبادیِ بسیچ سفرِ مشرق" یعنی سفرِ مشرق کے لیے آمادگی کے ابتدائی دنوں میں لکھا تھا۔ فی الواقع ان کا ارادہ یہی تھا اور گورنر جنرل کے نام اپنی عرضداشت میں انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ اگر نواب صاحب نے ان کے معروضات

پر توجہ نہیں فرمائی تو وہ اپنا مطالبہ کلکتے جا کر حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کریں گے۔[۲۳] لیکن نواب صاحب کی منّت سماجت نے انھیں مزید کچھ دنوں تک خاموش رہنے اور انتظار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مندرجہ ذیل بیان میں انھوں نے اسی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

''چوں سررشتۂ ہر کار بہ زمانے باز بستہ است، دراں کشاکش از بند نہ توانستم بدر جست۔ بے خودی گریبانم گرفت و بازم بہ دہلی آورد۔''

تفہیم غالب کی راہ کا پانچواں اور آخری سنگِ گراں جس نے ان خطوط سے اخذِ نتائج کو ان علم دوستوں کے لیے جو فارسی سے ناواقف ہیں، مزید دشوار بنا دیا ہے، ان کے وہ تراجم ہیں جو پچھلے چند برسوں میں شائع ہو کر سامنے آئے ہیں۔ یہ تراجم مفاہیم کی شکست و ریخت اور غلط تعبیرات و تشریحات کے ایسے حیرت انگیز و عبرت خیز نمونے ہیں کہ ان پر تبصرہ کرنے اور زوالِ علم و دانش پر آنسو بہانے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جہاں تک فارسی زبان و ادب سے شغف اور ذوق کا تعلق ہے، غالب کا عہد ہمارے عہد سے بہ درجہا بہتر تھا، اس کے باوجود انھیں یہ غم تھا کہ اس شہر میں کوئی ایسا نہیں جو ان کی بات کو سمجھ سکے:

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

آج جب کہ فارسی کے اساتذہ اور طالب علم جدید فارسی کی طرف بیش از بیش راغب اور کلاسکی فارسی سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں، اس ''غریبِ شہر'' کی بات سمجھنا اور بھی محال ہو گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ''من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید'' کے بہ مصداق وہ کہنا کچھ اور چاہتا ہے اور اس کے ترجمان اس کا کچھ اور مطلب نکال کر صورتِ واقعہ کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ وضاحت کے لیے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ خواجہ محمد حسن کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا تھا:

''امید کہ اجزائے خطابِ نواب سید عالم علی خاں صاحب رقم کنید و بہ من فرسید۔''[۲۴]

اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو ان خطابات کی تفصیل درکار تھی جو نواب سید

عالم علی خاں کو سرکار کی طرف سے ملے ہوئے تھے اور ان کے نام کے ساتھ عموماً لکھے جاتے تھے۔ ''اجزاے خطابی'' کی ترکیب انھوں نے اپنے بعض اردو خطوط میں بھی بعینہٖ اسی مفہوم میں استعمال کی ہے۔ مثلاً ''دستنبو'' کے سرورق پر نام کے اندراج کے سلسلے میں مرزا ہرگوپال تفتہؔ کو لکھتے ہیں:

''منشی شیونرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں۔ نام اور تخلص بس۔ اجزاے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔''[۲۵]

جدید فارسی سے متاثر ایک فاضل مترجم نے غالبؔ کی اس تعبیر کے برخلاف ان کے منقولۂ بالا جملے سے جو مفہوم اخذ کیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

''امید کرتا ہوں کہ نواب سید عالم علی خاں کی تقریر کے نکات لکھ کر مجھے بھیجیں گے۔''

''کاتا اور لے دوڑی'' کی مثالیں ان ترجموں کے صفحات پر جس افراط کے ساتھ بکھری ہوئی ہیں، ان کا حساب لگانا دشوار ہے۔ زیرِ ترجمہ عبارت کے ایک ایک جملے کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھنے اور اس کے مالہٗ وما علیہ پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد اپنی زبان میں منتقل کرنے کی بجاے عجلت اور رواروی میں کوئی مطلب نکال لینا اور اسے بیان کر دینا کس قدر خطرناک اور گمراہ کن ہو سکتا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ طلب ہے:

شیفتہؔ نے ''گلشنِ بے خار'' کا مسودہ بہ غرضِ مطالعہ و مشورہ غالبؔ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ غالبؔ نے انھیں یہ نسخہ واپس بھیجتے ہوئے جو خط لکھا تھا، اس میں من جملہ اور باتوں کے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ آپ نے آشوبؔ کا نام امداد علی بیگ لکھا ہے، یہ درست نہیں۔ ان کا اصل نام میر امداد علی اور ان کے والد کا نام میر روشن علی خاں ہے اور یہ لوگ اس دیار کے ''اعیانِ سادات'' میں سے ہیں۔ شیفتہؔ نے اس پر شکریہ ادا کیا۔ اس کے جواب میں غالبؔ لکھتے ہیں:

''ہنگامہ بیش ازیں نیست کہ میانجی گری کردہ ام و وکالتِ میر امداد علی خاں بجاے آوردہ۔ اگر منتے است، براں بزرگوار است نہ بر

ملازماں۔"

ایک محترم ترجمہ نگار نے اس جملے کے ایک لفظ "منتے" کو جو یائے معروف کے ساتھ لکھا ہوا تھا، بے خیالی میں "منشی" پڑھ لیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ یہ ترجمہ فرما دیا:

"حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ میں نے میاں جی گری کی ہے اور میر امداد علی کی وکالت کا فرض انجام دیا ہے۔ اگرچہ وہ منشی ہے لیکن بزرگ شخص ہے۔ وفا پیشہ ہے اور ملازمانِ بارگاہ کی توجہ کا مستحق ہے۔"

"وفا پیشہ" اس ترجمے میں کہاں سے داخل ہوا، یہ بھی حیرت و عبرت سے دیکھنے کے قابل ہے۔ خط کا اگلا جملہ یہ تھا:

"گزارشِ اندیشۂ وفا پیشہ بہ سنجیدنِ زمزمۂ تقریظ پارہ بہ فرمانِ مہر است۔"

"وفا پیشہ" کی ترکیب یہاں "اندیشہ" کی صفت کے طور پر استعمال ہوئی ہے اور اس کا تعلق غالب کی اپنی ذات سے ہے۔ فاضل مترجم نے اسے اپنے دریافت کردہ منشی سے متعلق قرار دے کر نہایت اطمینان کے ساتھ حامد کی ٹوپی محمود کے سر پر رکھ دی ہے۔

مقالے کو زیادہ سے زیادہ مثالوں سے گراں بار بنانا مقصود نہیں، اس لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک ترکیب لفظی کے حوالے سے صرف ایک مترجم کی گل افشانیوں کے چند نمونے بہ طورِ مثال پیش کر دیے جائیں۔ یہ ترکیب ہے "چشم روشنی"، جس کے معنی تہنیت یا مبارکباد کے ہیں۔ غالب نے اسے اپنے فارسی خطوط میں بہ کثرت استعمال کیا ہے۔ علاوہ بریں "پنج آہنگ" کے آہنگ اول "در القاب و آداب و ما یتعلق بہا" کے تحت بھی فقرات تہنیت کے ذیل میں انھوں نے ایک جگہ "در چشم روشنیِ حصول صحت" کا عنوان قائم کیا ہے۔ مختلف خطوط میں اس کے استعمال اور اردو میں اس کے ترجمے کی یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) ''من دانم ودلِ من کہ دریں چشم روشنی کہ پیش آوردۂ دولت وساز کردۂ اقبال است، از اقسامِ سخن چہا بہ کار رفتے۔''
(مکتوب نمبر۲، بہ نام منشی محمد حسن۔ کلیاتِ نثرِ غالب، ۱۸۷۱ء، ص ۹۷)

''میں جانتا ہوں اور میرا دل کہ اس چشم روشن میں کہ پیش آوردۂ دولت اور ساز پارۂ اقبال ہے، کیا کیا جلوے نہ ہوتے......''

(۲) ''برادرِ عالی قدر...... میرزا علی بخش خاں بہادر...... درگزارشِ شیوۂ چشم روشنی وعرضِ مراسمِ تہنیت با نامہ نگار ہم زبانند۔''
(ایضاً، مکتوب نمبر۲، بہ نام منشی محمد حسن، ص ۹۸)

''برادرِ عالی قدر...... میرزا علی بخش خاں بہادر...... گزارشِ شیوۂ چشم روشنی اور پیش کشِ مراسمِ تہنیت میں اس نامہ نگار کے ہم زبان ہیں۔''

(۳) خود را بدیں پیش آمدنِ اقبال چشم روشنی گویم۔''
(مکتوب نمبر ۳۶، بہ نام سراج الدین احمد، ص ۱۲۹)

''اپنے آپ کو اقبال مندی کی اس نیک ساعت کے لیے ''چشمِ بددور'' کہتا ہوں۔''

(۴) ''جماعتے از قدسیاں بہ یمین ویسارِ من چشم روشنی گوے۔''
(مکتوب نمبر ۱۱۹، بہ نام امیر حسن خاں، ص ۲۰۸)

''قدسیوں کی ایک جماعت میرے دائیں بائیں ''چشمِ ما روشن'' کہتی ہوئی ایستادہ ہے۔''

(۵) ''چہ باید کرد تا روشناسِ نگاہِ التفات تواں شد وخود را بہ پیش آمدِ اقبال چشم روشنی تواں گفت۔''
(مکتوب نمبر ۱۲۵، بہ نام امداد حسین خاں، ص ۲۱۴)

''ایسا کیا کیا جائے کہ میں روشناسِ التفات ہو جاؤں اور خود کو چشمِ روشن کی عرصہ گاہِ اقبال میں پیش کرسکوں۔''

(۶) ''ورودِ منشورِ رافتِ قبلۂ دو جہانی...... دیدہ را جلا و دل را صفا داد۔ نے نے دیدہ و دل را چشم روشنی گوے ہم ساخت۔''
(مکتوب نمبر ۱۲۶، بہ نام انور الدولہ شفق، ص ۲۱۵)

''قبلۂ دو جہاں کے منشورِ عنایت کے ورود نے دل کو جلا اور نظر کو صفا بخشی۔ تا نا چشمِ روشن نے دیدہ و دل کو ایک دوسرے سے الگ نہ رکھا۔''

(۷) آید بہ چشم روشنیِ ذرّہ آفتاب
بر ہر زمیں کہ طرح کنی نقشِ پاے را
(مکتوب نمبر ۱۳۶، بہ نام شفق، ص ۲۲۴)

''میری نگاہوں میں ذرّے کی روشنی بھی آفتاب کی درخشانی سے کم نہیں ہوتی۔ جہاں میں زمین پر تیرے نقشِ قدم کو روشنیاں بکھراتا دیکھتا ہوں۔''

(۸) ایضاً آید بہ چشم روشنیِ ذرّہ آفتاب الخ
(مکتوب نمبر ۱۴۰، بہ نام مولوی سید محمد، ص ۲۲۸)

''جس سرزمین پر ان کے نقشِ پا کی روشنی ہوگی، ہر ذرّہ مانند آفتاب کے روشن و تابناک ہوگا۔''

(۹) ''یارب! چشم روشنیِ شادیِ کتخدائیِ...... خواجہ منیر الدین خاں بہادر بہ کدام دستگاہ ساز دہم۔''
(مکتوب نمبر ۱۴۵، بہ نام انور الدولہ، ص ۲۳۴)

''خدایا مجھے چشمِ روشن عطا کر کہ میں...... خواجہ منیر الدین خاں بہادر کی شادیِ کتخدائی کی خجستہ رسوم کو حسنِ دستگاہ کے ساتھ پیش کروں۔''

(۱۰) ''مبارز الدولہ در سپاسِ یاد آوری و عطاے مثنوی کورنش بجاے آوردہ، ایں چہار رباعی در چشم روشنیِ رویاے صادقہ بہ حضور فرستادہ اند۔''

''یہ رباعیاں مبارز الدولہ نے یاد فرمائی اور عطاے مثنوی کے سلسلے میں نذرانۂ تشکّر کے طور پر بادشاہ کی ان آنکھوں کے سامنے پیش کش کی غرض سے بھیجی ہیں جنھوں نے وہ خواب دیکھا ہے۔''

ان معروضات سے یہ بات بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ غالبؔ کے فارسی خطوط کا بڑا

حصہ بہ صورتِ موجودہ اپنی گونا گوں داخلی و خارجی خامیوں کی وجہ سے استناد کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ یہی حال مختلف مجموعوں کے ان اردو ترجموں کا بھی ہے جو ۱۹۶۹ء سے اب تک شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خطوط کے مطالعے کو با مقصد اور ان سے استفادے کو با معنی بنانے کے لیے انھیں جدید اصولِ تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے صحیح متن کا پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ متن درست نہ ہوگا تو اس کی تعبیر و تفہیم کی کوئی بھی صورت قابلِ اعتماد اور لائقِ توجہ نہ ہوگی۔

حواشی:

۱ تفصیل کے لیے دیکھیے: آثارِ غالب (طبعِ ثالث)، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۸

۲ پنج آہنگ، مرتبہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ص ۶۳۲، ۶۳۳

۳ غالب کا قیامِ لکھنؤ، ہفت روزہ ہماری زبان، نئی دہلی، شمارہ یکم مارچ ۱۹۸۰ء

۴ غالب کے ہاں مولوی سراج الدین احمد کے نام کے ۱۳/اپریل ۱۸۳۲ء کے خط میں صرف ایک بار اور وہ بھی بالواسطہ ان کا ذکر آیا ہے۔ گورنر جنرل کے دورۂ دہلی کے موقعے پر ان کے حضور میں شرفِ باریابی حاصل کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دریں ہنگامہ میر حامد علی خاں دامادِ اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں نیز ملازمت حاصل ساختہ۔''
>
> (کلیاتِ نثرِ غالب، لکھنؤ، ۱۸۷۱ء، ص ۱۳۸)

۵ غالب کا یہ قطعہ حسبِ ذیل ہے:

چو میر فضلِ علی را نہ ماندہ است وجود
تو روے دل بخراش اے اسیرِ رنج و محن
چو شد وجود گم و روے دل خراشیدہ
شود زاسمِ خودش سالِ رحلتش روشن

''میر فضلِ علی'' کے مجموعی اعداد ۱۲۷۰ ہوتے ہیں۔ اس میں سے ''وجود'' کے ۱۹ اور

روے دل یعنی دال کے چار کل ۲۳ عدد کم کر کے سالِ رحلت ۱۲۴۷ھ حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف کمال الدین حیدر نے ان کی تاریخِ وفات "۱۹ر ماہِ شوال ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء" بتائی ہے۔ (تواریخِ اودھ، جلد اول، لکھنؤ، ص ۳۰۶) یہ تاریخ مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اولاً اس لیے کہ ہجری اور عیسوی سنہ باہم مطابق نہیں۔ ہجری تاریخ کی رو سے صحیح عیسوی تاریخ ۱۳ر اپریل ۱۸۳۰ء قرار پائے گی۔ ثانیاً اس بنا پر کہ غالبؔ کی متخرجہ تاریخ میں حساب کی غلطی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

۶۔ باغِ دودر، مرتبہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۶

۷۔ یادگارِ غالبؔ، لاہور، ۱۹۲۴ء، ص ۳۴۳

۸۔ غالبؔ۔ احوال و آثار از حنیف نقوی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ص ۸۲، ۸۳

۹۔ دیوانِ غالبؔ، نسخۂ عرشی (طبعِ اوّل)، رام پور، ۱۹۵۸ء، ص ۲۵

۱۰۔ سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، شمارہ جنوری ۱۹۶۱ء۔ ماہنامہ نقوش، لاہور، شمارہ نومبر ۱۹۶۴ء

۱۱۔ ماہنامہ نقوش، لاہور، شمارہ نومبر ۱۹۶۴ء

۱۲۔ دیوانِ غالبؔ، نسخۂ عرشی (طبعِ ثانی)، رام پور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۶

۱۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم السطور کا مقالہ: حکیم احسن اللہ خاں۔ چند معروضات، مشمولہ سہ ماہی اردو ادب، نئی دہلی،
شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ص ۲۹، ۳۰

۱۴۔ گلِ رعنا، مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۵۱

۱۵۔ نامہ ہاے فارسیِ غالبؔ، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰

۱۶۔ فسانۂ غالبؔ، از مالک رام، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ص ۱۱۱، ۱۱۲

۱۷۔ غالبؔ نامہ، از شیخ محمد اکرام، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ص ۶۶ تا ۶۸۔ غالبؔ یات اور ہم، از ابو محمد سحرؔ، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ص ۶۵ تا ۶۷

۱۸۔ سہ ماہی اردو، کراچی، خصوصی شمارہ بہ یادگارِ غالبؔ، حصہ دوم، ۱۹۶۹ء، ص ۸۴

۱۹۔ ذکرِ غالبؔ، از مالک رامؔ، دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۶۴۔ ذکرِ غالبؔ۔ کچھ نئے حالات، ماہنامہ افکار، کراچی، غالبؔ نمبر، ۱۹۶۹ء۔ ذکرِ غالبؔ، دہلی، ۱۹۷۷ء

۲۰۔ نامہ ہائے فارسیِ غالب، مقدمہ انگریزی، ص ص ۲۰،۱۹

۲۱۔ غالب درونِ خانہ، از کالی داس گپتا رضا، بمبئی، ۱۹۸۹ء، ص ص ۸۶، ۸۷، ۸۸

۲۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم السطور کا مقالہ: غالب کا ایک فارسی خط اور ان کا سفرِ فیروز پور، مشمولہ غالب کی مکتوب نگاری، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، دہلی، ۲۰۰۳ء

۲۳۔ فسانۂ غالب، ص ۱۱۰

۲۴۔ آثارِ غالب، ص ۶۶

۲۵۔ غالب کے خطوط، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلد اول، ۱۹۸۴ء، ص ص ۲۸۹، ۲۹۰

غالبؔ کے چار غیر مطبوعہ فارسی خط

مرزا غالبؔ کو ایک صاحب اسلوب نثر نگار کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہے، اس کا سہرا ان کے اردو خطوط کے سر ہے، لیکن یہ ۱۸۴۸ء کے بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے وہ صرف فارسی میں خط لکھتے تھے۔ اردو خطوط کی طرح ان کے یہ فارسی خط بھی ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے جاتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان خطوط کو بیاضوں میں نقل کرنے اور اس طرح ادب وانشا کے قابلِ قدر نمونوں کی حیثیت سے آئندہ نسلوں کے لیے بہ طور یادگار محفوظ رکھنے کا سلسلہ غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کے زمانے (۱۸۲۶ء تا ۱۸۲۹ء) میں شروع ہو گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور بہی خواہوں کو حالاتِ سفر اور مقدمۂ پنشن کے کوائف سے باخبر رکھنے کے لیے بڑی پابندی اور تسلسل سے خط لکھ رہے تھے۔ 'متفرقاتِ غالب' مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، 'مآثر غالب' مرتبہ قاضی عبدالودود اور 'نامہ ہائے فارسی غالب' مرتبہ سید اکبر علی ترمذی میں جو خطوط شامل ہیں وہ سب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور جن بیاضوں سے حاصل کیے گئے ہیں، ان کی ترتیب وتسوید اسی زمانے میں ہوئی ہے۔

جہاں تک خود غالبؔ کا تعلق ہے، انھیں شروع میں ان خطوط کی نقلیں محفوظ رکھنے اور

انھیں بہ صورتِ بیاض مرتب کرنے سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں جب ان کے برادرِ نسبتی مرزا علی بخش خاں نے ان کی مختلف فارسی تحریروں کو یکجا کرکے 'پنج آہنگ' کے نام سے مرتب کیا تو اس کے ایک آہنگ میں ان کے چند فارسی خطوط بھی شامل کیے۔ اس طرح پہلی بار ان کی ادبی حیثیت کے تعیّن کی راہ ہموار ہوئی۔ جب اس کتاب کی شہرت عام ہوئی اور باذوق احباب اور قدردانوں کی طرف سے اس کی طلب کے لیے فرمائشیں آنے لگیں تو خود غالب کو بھی اپنی ان تحریروں کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ خطوط اس مجموعۂ نگارشات کا ایک اہم جز ہیں اور چونکہ 'پنج آہنگ' کے اولین نسخے[1] میں ان کی تعداد صرف اٹھارہ تھی، اس لیے اس حصے میں ابھی مزید اضافوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی زمانے کے ایک خط میں اپنے ''مخلصِ صادق الولا'' مولوی سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں:

> ''درتمامیِ سفینۂ نثر سخن است، چہ آں وابستہ بہ تفقدیست کہ از جانب مخدوم باید و آں تفقد کہ درخیال نقش بستہ ام، جز ایں نیست کہ از نگارش ہائے من انچہ درنظر آں والا گہر است، بہ من باز رسد تا آں نیز بہ سبیلِ انتخاب والتقاط دراں جریدہ جایابد۔''[2]

بعد کے اضافہ شدہ نسخوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خطوط کے علاوہ زمانۂ ماقبل کی کوئی ایسی تحریر شامل نہیں جو غالب کی اس طلب کے جواب میں انھیں موصول ہوئی ہو اور جس کے حصول کا مقصد اس سفینۂ ناتمام کی تکمیل رہا ہو۔ چنانچہ اولین نسخے کے اٹھارہ خطوط کی بہ نسبت ربیع الاول ۱۲۵۶ھ مطابق مئی ۱۸۴۰ء کے لکھے ہوئے ایک قلمی نسخے (مملوکہ کالی داس گپتا رضا) میں یہ تعداد بڑھ کر تریسٹھ اور رجب ۱۲۵۷ھ مطابق اگست ۱۸۴۱ء کے مکتوبہ نسخے (مخزونہ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری) میں بہتّر ہو گئی ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری ہی کے ایک اور قلمی نسخے میں جو بعض داخلی شواہد کے مطابق ۱۸۴۴ء کے اوائل کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہ تعداد ۱۲۵ تک پہنچ گئی ہے۔ ان تمام مخطوطات اور متداول مطبوعہ نسخوں میں مکتوب نمبر ۶۲ تک بہ اعتبارِ ترتیب کوئی فرق نہیں۔ بعد کے خطوط کو اشاعت کے وقت ازسرِنو ترتیب دیا گیا ہے۔ اول الذکر تینوں مخطوطات میں خطوط پر سلسلہ وار نمبر درج نہیں۔ برخلاف اس کے آخر الذکر مخطوطے میں تمام خطوط پر مطلوبہ ترتیب کے مطابق نمبر ڈال کر ہر خط کا سلسلہ وار مقام متعین کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ

ترتیب بھی کلی طور پر موجودہ ترتیب کے مطابق نہیں۔ اس نسخے کے ۱۲۵ خطوط میں پانچ ایسے خط بھی شامل ہیں، جن پر کوئی نمبر درج نہیں۔ یہ خطوط بہ تفصیلِ ذیل چار مکتوب الیہم کے نام ہیں:

(۱) مکتوب نمبر ۸۰ بہ نام شیخ امام بخش ناسخ

(۲) مکتوب نمبر ۱۰۳، بہ نام تامسین صاحب سکرتر اعظم نواب گورنر جنرل بہادر

(۳) مکتوب نمبر ۱۱۷، بہ نام نواب مظفر الدولہ مرزا سیف الدین حیدر خاں بہادر

(۴ و ۵) مکتوب نمبر ۱۱۸، ۱۱۹، بہ نام معین الدولہ مرزا ذوالفقار الدین حیدر خاں بہادر، ذوالفقار جنگ

ان پانچ خطوں میں سے پہلا خط متداول مطبوعہ نسخوں میں مکتوب الیہ کے نام کے ایک اور خط کے فوراً بعد ۸۸ ویں نمبر پر شامل ہے۔ باقی چاروں خطوط ہنوز غیر مطبوعہ ہیں اور اس مضمون کے توسط سے پہلی بار ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔

مسٹر جیمس تھامسن (متوفی ۲۸ ستمبر ۱۸۵۳ء) کے نام غالبؔ کے تین خط اور موجود ہیں جو پنج آہنگ کے مطبوعہ نسخوں میں نمبر ۱۰۲، نمبر ۱۰۳ اور نمبر ۱۱۷ پر درج ہیں۔ ان میں سے آخری خط صوبۂ شمال مغربی کی لیفٹیننٹ گورنری کے منصب پر مکتوب الیہ کی ترقی کی تہنیت میں لکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے دونوں خط اس زمانے کے ہیں جب وہ "سکرتر بہادر نواب گورنر اکبرآباد" کے عہدے پر فائز تھے۔ 'دہلی اردو اخبار' کی ایک خبر کے مطابق اس عہدے پر ان کا تقرر ۷/جون ۱۸۴۰ء سے کچھ پہلے عمل میں آیا تھا[۳] جب کہ لیفٹیننٹ گورنری کے منصب پر ترقی ۹/نومبر ۱۸۴۳ء کا واقعہ ہے[۴]۔ اس اعتبار سے پہلے دونوں خط جون ۱۸۴۰ء اور نومبر ۱۸۴۳ء کی درمیانی مدت کے اور تیسرا خط ۹/نومبر ۱۸۴۳ء سے کچھ دن بعد کا ہونا چاہیے۔ نودریافت خط میں مکتوب الیہ موصوف کو "سکرترِ اعظم نواب گورنر جنرل بہادر" کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ یقیناً جون ۱۸۴۰ء سے پہلے کی تحریر ہے۔ خط کے آغاز ہی میں غالبؔ نے لکھا ہے:

'بندہ..... پیش ازیں عرض داشت انگریزی سرکاری بہ پیش گاہِ گیتی پناہِ شہریاری و جہاں داری یعنی محکمۂ عالیۂ گورنری فرستادہ است۔"

دستیاب رکارڈ کے مطابق غالبؔ نے ۱۸۴۰ء سے قبل انگریزی میں ایک عرض داشت لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل آف انڈیا کے نام ۲۳/مارچ ۱۸۳۶ء کو، دوسری ۱۴/نومبر ۱۸۳۶ء کو اور

تیسری ۹ راگست ۱۸۳۷ء کو روانہ کی تھی [5]۔ چونکہ اسی خط میں آگے چل کر یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ''رسیدن عرض داشت با جنبش موکب ہمایونِ گورنری مقارن افتادہ است'' اور لارڈ آکلینڈ ۱۸۳۷ء کے اواخر میں کلکتے سے اودھ اور شمالی ہند کے دورے پر روانہ ہوئے تھے [6]۔ اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط اکتوبر سے دسمبر ۱۸۳۷ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا ہوگا۔

مکتوب نمبر ۱۱۷ کے مکتوب الیہ نواب مظفر الدولہ مرزا سیف الدین حیدر خاں بہادر سیف جنگ، مبارز الدولہ، ممتاز الملک نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر، حسام جنگ کے فرزند اکبر تھے۔ یہ وہی حسام الدین حیدر ہیں جنھیں غالبؔ نے 'مثنوی چراغ دیر' میں ''حرزِ بازوے ایماں'' کہا ہے اور علامہ فضل حق خیر آبادی اور نواب امین الدین احمد خاں کے ساتھ ان تین ''اربابِ وطن'' میں شمار کیا ہے، جو دہلی میں ان کے ہمدرد و غم خوار تھے اور جن کی جدائی انھیں بے حد شاق تھی۔ حسام الدین حیدر، میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک صوبہ دارِ اودھ کے ہم جد اور اودھ کے رئیسوں میں سے تھے۔ جب ان کے والد مرزا غیاث الدین محمد نے شاہ عالم ثانی کے وزیر ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کی بیٹی سے دوسری شادی کر لی تو یہ سوتیلی ماں کے ناروا سلوک سے دل برداشتہ ہو کر دلّی چلے گئے، جہاں اکبر شاہِ ثانی نے انھیں اپنے دربار میں مستقل عہدے کے علاوہ سات گانو بھی بہ طور جاگیر عطا کیے اور مبارز الدولہ، ممتاز الملک، حسام جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا۔ دہلی میں شاہانِ اودھ کی املاک کا انتظام بھی انھی کے سپرد تھا۔ خود انھوں نے بلّی ماران میں کئی عالی شان مکانات اپنی رہائش کے لیے بنوالے تھے۔ مختصر یہ کہ دہلی میں رئیسانہ شان و شوکت کے ساتھ رہتے تھے۔ اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ نامیؔ تخلص تھا۔ غالبؔ نے ان کی دیوان کے لیے تقریظ بھی لکھی تھی جو 'پنج آہنگ' کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۵۳ء) اور بعد کے تمام ایڈیشنوں میں شامل ہے۔ مالک رام نے ''حالاتِ نواب حسام الدین حیدر خاں'' (قلمی) مؤلفہ اکبر مرزا کے حوالے سے لکھا ہے کہ نامیؔ نے میر مستحسن خلیقؔ اور میر تقی میرؔ دونوں سے مشورۂ سخن کیا تھا نیز ان کی وفات دہلی میں بہ عارضۂ فالج ۲۲ رشوال ۱۲۶۲ھ مطابق ۳ راکتوبر ۱۸۴۶ء کو ہوئی [7]۔

مولانا حالی کے مطابق ''میر تقی میرؔ نے جو مرزا (غالب) کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا [8]۔'' اس واقعے کے ذیل میں

مولانا نے حاشیے میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "مرزا کے اشعار ان کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والدِ ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے[9]۔" اس روایت کے اس جز سے کہ نواب حسام الدین حیدر غالب کے بچپن کے دوست تھے، اتفاق ممکن نہیں، کیونکہ غالب کا بچپن آگرے میں گزرا تھا اور نواب صاحب کے ایامِ طفلی بالیقین فیض آباد میں بسر ہوئے ہوں گے۔ علاوہ بریں دونوں کی عمروں میں جو فرق تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نواب کے فرزندِ اکبر مرزا صاحب سے ان کے مبینہ سالِ ولادت (۱۲۱۲ھ) کے مطابق صرف آٹھ برس چھوٹے تھے۔

مرزا حسام الدین حیدر نے تین اولادیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں سب سے بڑے مظفر الدولہ مرزا سیف الدین حیدر تھے جو زیرِ بحث خطوں میں سے دوسرے خط کے مکتوب الیہ ہیں۔ ان سے چھوٹی ایک بہن قدسیہ سلطان تھیں، جن کے صاحبزادے امتیاز الدولہ سید ناصر الدین حیدر عرف یوسف مرزا غالب کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ تیسری اولاد معین الدولہ، ذوالفقار الدین حیدر تھے جو مالک رام صاحب کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق اپنی بہن سے چار برس اور بھائی سے چودہ برس چھوٹے تھے۔ آخری دونوں خطوط انھی کے نام ہیں۔

مظفر الدولہ مرزا سیف الدین حیدر اپنے والد کے مستخرجہ مادہ ہائے تاریخ "ارشد وار جمند و صاحب قدر" اور "ہے عطائے شیر خدا" کے مطابق ۱۲۲۰ھ (۶-۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے تھے[10]۔ انھوں نے خاندانی جائداد کے سہارے تا عمر آزادانہ زندگی بسر کی اور کبھی کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔ ان کی عالی شان اور وسیع و عریض حویلی بلّی ماران میں مرزا غالب کے مکان سے پچھم کی طرف تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھی۔ ایامِ غدر میں جب وہ مع اپنے تمام افرادِ خاندان اور متعلقین کے بھرے پُرے مکانات چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں شہر سے باہر جا چکے تھے، ۱۷-۱۸ر نومبر کی درمیانی شب میں ان مکانات کو مع ان کے تمام ساز و سامان کے آگ لگا دی گئی۔ غالب اٹھتے ہوئے شعلوں اور پھیلتے ہوئے دھوئیں کا یہ منظر اپنے مکان کی چھت سے دیکھ رہے تھے۔ 'دستنبو' میں انھوں نے اس واقعے کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے:

> دراں نیم شب فروغِ آتش فروزاں از فرازِ بام ہمی نگرستم و گرمیِ دو بہ چشم و رخِ من می رسید وازاں رو کہ دراں دم بادِ بریں می وزید،

خاکستر بہ سراپائے من ہمی افتاد۔''[11]

مظفر الدولہ نے اس ہنگامے میں الور کی راہ لی تھی، جہاں کے راجا سے ان کے دوستانہ روابط تھے۔ شورش فرو ہونے کے بعد جب گیرودار کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ الور سے گرفتار کر کے گڑگانو لائے گئے، جہاں انگریز افسروں نے ضابطے کی کسی کارروائی کے بغیر انھیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ یہ واقعہ یکم جنوری ۱۸۵۹ء سے نافذ العمل ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی کے اعلان سے پہلے ۱۸۵۸ء میں کسی وقت پیش آیا ہوگا۔ غالب نے یوسف مرزا کے نام جون ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں اس حادثۂ فاجعہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مظفر الدولہ کا غم من جملۂ واقعاتِ کربلائے معلّی ہے۔ یہ داغِ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔''

مظفر الدولہ کے نام کے دریافت شدہ خط میں اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں کی دہلی میں موجودگی کا حوالہ اس کے زمانۂ تحریر کے تعین کے سلسلے میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ 'پنج آہنگ' میں موجود اعتقاد الدولہ ہی کے نام کے ایک خط سے جو ایک واضح اشارے کے مطابق ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء کا لکھا ہوا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اصلاً کان پور کے رہنے والے تھے اور کچھ ہی دنوں پہلے مظفر الدولہ نے لکھنؤ کے سفر سے واپسی پر غالب سے ان کا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ ایک اور خط موسومہ مظفر حسین خاں سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تحریر سے پہلے اعتقاد الدولہ دہلی سے واپس جا چکے تھے۔ ان کی واپسی کو مکتوب الیہ سے مراسلت کی تقریب بناتے ہوئے غالب نے لکھا ہے:

> ''دلِ غم زدہ داشتم کہ اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں بردو پنہاں از من بہ
> یکے از دیریں دوستانِ خویش سپرد۔''

اس خط کی ابتدا سات اشعار پر مشتمل ایک قطعے سے ہوتی ہے، جو کلیاتِ نظم فارسی کے قلمی نسخے مکتوبہ ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۴ھ/ ۴ جولائی ۱۸۳۸ء (مخزونہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ) میں حاشیے پر درج ہے اور ایک اور نسخے مکتوبہ ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۵۷ھ/ ۲۹ دسمبر ۱۸۴۱ء (ایضاً مخزونہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ) میں شاملِ متن کر لیا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مظفر حسین خاں کے نام کا یہ خط ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء میں اعتقاد الدولہ سے غائبانہ تعارف کے بعد اور ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء میں کلیاتِ فارسی کے ثانی الذکر نسخے کے اہتمام سے قبل لکھا گیا تھا۔ اس پس منظر میں مظفر الدولہ کے نام کا زیرِ بحث خط حتمی طور پر ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء کی تحریر قرار پاتا ہے۔

معین الدولہ نواب سید ذوالفقار الدین حیدر خاں بہادر ذوالفقار جنگ معروف بہ حسین مرزا اپنے برادرِ بزرگ سے چودہ سال چھوٹے تھے۔ اس اعتبار سے وہ اندازاً ۱۲۳۴ھ (۱۹-۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ عبدالرؤف عروج نے ان کا سالِ ولادت ۱۲۲۳ھ بتایا ہے[۱۲]۔ یہ بہ ظاہر ۱۲۳۳ھ کی تصحیف ہے جو از روے قرائن ۱۲۳۴ھ کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں ان کی عرفیت حسین مرزا کے علاوہ ''ناظر جی'' کے نام سے بھی بہ کثرت ان کا ذکر کیا ہے۔ ناظر جی کے نام سے موسوم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شادی ضمیر الدولہ، جلیل الملک، افتخار الامرا، احمد حسین نظارت خاں بہادر مستقیم جنگ کی صاحبزادی حسینی بیگم کے ساتھ ہوئی تھی۔ جب احمد حسین خاں کا انتقال ہو گیا تو حسین مرزا ان کی جگہ شاہی نظارت کے منصب پر فائز ہوئے اور غدر کے زمانے تک اسی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے۔ شاہی ملازم ہونے کی وجہ سے سقوطِ دہلی کے بعد ان کا عتاب میں آنا لازمی تھی، لہٰذا انھوں نے موقع پا کر پہلے صفدر جنگ کے مقبرے میں پناہ لی۔ بعد ازاں نواب حامد علی خاں[۱۳] کی تحریک پر ان کے ساتھ نواحِ پانی پت میں واقع ان کے آبائی گانو برست چلے گئے۔ گھر سے دس ہزار روپے کی جو رقم ساتھ لے کر نکلے تھے، وہ اجمیری دروازے سے مقبرۂ صفدر جنگ تک ساتھ آٹھ کلومیٹر کے سفر میں گوجروں نے لوٹ لی تھی۔ جب انگریز حکام کو برست میں ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وارنٹ جاری کر کے ان کی گرفتاری کی کارروائی شروع کر دی گئی، لیکن اس حکم پر عمل درآمد سے قبل وہ چھپتے چھپاتے برست سے پانی پت پہنچ گئے، جہاں انصاریوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر انھیں گرفتاری سے محفوظ رکھا۔ پانی پت سے بھیس بدل کر وہ لکھنؤ پہنچے اور عام معافی کا اعلان ہونے کے وقت تک وہاں روپوش رہے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک وہاں کے حکام سے ملتے اور پنشن کے اجرا کے لیے کوشش کرتے رہے[۱۴]۔ لیکن جب یہ مہم کامیاب نہیں ہوئی تو غالباً ۱۸۶۰ء کے اوائل میں دہلی چلے آئے[۱۵]۔ یہاں ان کی ساری جائداد بہ حق سرکار ضبط ہو چکی تھی۔ بے سروسامانی اور عسرت و تنگ دستی کے ان ایام میں لکھنؤ کے بعض عزیزوں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے حتی المقدور ان کی دست گیری کی۔ ۱۸۶۲ء کے اوائل میں انھیں سرکار کی طرف سے رہنے کے لیے ایک مکان مل گیا تھا، لیکن مجموعی طور پر جو حالت تھی، اس کا اندازہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام غالب کے ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء کے ایک خط کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے:

”ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس
ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر
دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔“

نواب مختار الملک میر تراب علی خاں، وزیر اعظم حیدر آباد مارچ ۱۸۷۰ء میں دہلی آئے تو شہر کے دوسرے روٴسا و عمائدین کے ساتھ حسین مرزا نے بھی ان سے ملاقات کی۔ مختار الملک ان سے مل کر بہت متاثر ہوئے اور انھیں مستقلاً حیدر آباد چلے آنے کی دعوت دی، لیکن قبل اس کے کہ حسین مرزا ارادۂ سفر کریں، ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ بیماری جنون کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی باقی زندگی اسی جنون کے عالم میں گزاری اور اسی حالت میں ۶ رمضان المبارک ۱۳۰۶ھ (۶ مئی ۱۸۸۹ء) کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ میر مہدی مجروحؔ نے اس موقعے پر یہ قطعۂ تاریخ کہا:

حسین میرزا چوں مرد در ششِ رمضاں   ازاں کہ بود زنسلِ امیر خیبر گیر
پے شمارۂ سالِ وفات رضواں گفت   بیا بکاخِ جناں اے امیر ابن امیر [16]

غالبؔ کے کلامِ نظم و نثر کی جمع و تدوین کے سلسلے میں بھی حسین مرزا کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ وہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں غالبؔ کے ان دو قریب ترین دوستوں اور ارادت مندوں میں سے تھے جو بڑی پابندی اور دلچسپی کے ساتھ ان کی نگارشات کو یک جا کرنے کا کام کرتے رہتے تھے۔ غدر میں ان لوگوں کے مکانات لٹے تو غالبؔ کا کلام بھی اس تباہی اور دست برد کی زد میں آیا اور برباد ہو گیا۔ غالبؔ نے مرزا حاتم علی مہرؔ کے نام اوائل نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں حالات کی اس چیرہ دستی کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے:

”میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور
نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا، انھوں نے لکھ
لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے
برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔“

اسی زمانے کے ایک اور خط میں مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ کو لکھتے ہیں:

”غدر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔

ہاں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب
ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسوّدات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع
کرلیا کرتے تھے سوان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی
نہ اسباب رہا۔ اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں۔"

حسین مرزا کے نام کے دونوں خطوط سفارشی نوعیت کے ہیں۔ پہلے خط میں ایک غریب الوطن سیّد کی مالی مدد کے لیے اور دوسرے میں شیخ مشتاق حسین مشتاقؔ نامی ایک ریختہ گو شاعر کی مرثیہ خوانوں کے زمرے میں ملازمت کے لیے سعی و سفارش کی استدعا کی گئی ہے۔ غالب کے متعدد خطوط اس پر شاہد ہیں کہ وہ مستحقین اور حاجت مندوں کی سفارش کے معاملے میں بے حد کشادہ دل تھے۔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے نام ۲۲؍جولائی ۱۸۶۱ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے کچھ دنوں پہلے علی بخش خاں خان ساماں کی وساطت سے حسن علی خاں کے بیٹوں نیز میر مہدی مجروحؔ کے چھوٹے بھائی میر سرفراز حسین اور ان کے دوست میر افضل علی عرف میرن صاحب کی سفارش کی تھی تاکہ ان لوگوں کے لیے ان کے حسب حیثیت روزگار کا کوئی مناسب انتظام ہو جائے۔ ممکن ہے کہ حسین مرزا کے نام کے اس خط میں بھی "سیّدِ غریب الوطن" سے آخرالذکر دونوں میر صاحبان ہی میں سے کوئی ایک صاحب مراد ہوں۔ دوسرے خط میں مذکور شیخ مشتاق حسین مشتاقؔ کے بارے میں بھی باوثوق طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس شہر کے رہنے والے تھے اور غالبؔ سے ان کا کیا رشتہ تھا۔ اشپرنگر کے تذکرے 'یادگارِ شعرا' (مترجم طفیل احمد) میں ایسے کسی شاعر کا ذکر موجود نہیں۔ اسی نام اور تخلص کے ایک اور شاعر کا ذکر محسنؔ لکھنوی کے تذکرے 'سراپا سخن' اور عبدالغفور خاں نساخؔ کے تذکرے 'سخن شعرا' میں بھی آیا ہے۔ محسنؔ نے ان کا تعارف ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے:

"مشتاق حسین مشتاقؔ ولد قمرالدین حسین، باشندۂ اکبرآباد،
شاگرد اور مریدِ حضرت ظلِ سبحانی ظفرؔ۔ ہر غزل میں تخلص بادشاہ
کا بھی لاتے ہیں۔[کے]"

بعید از امکان نہیں کہ غالبؔ نے جن مشتاق حسین کی سفارش کی تھی، وہ انھی دونوں شاعروں میں سے کوئی ایک ہوں۔ چونکہ ثانی الذکر مشتاقؔ غالبؔ کے ہم وطن تھے اور بعد کے

زمانے میں دہلی میں ان کی موجودگی کے شواہد موجود ہیں، اس لیے قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس خط میں انھی کی سفارش کی گئی ہوگی۔

معین الدولہ کے نام کے یہ دونوں خط کس زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، اس کے تعین کا کوئی بہت واضح قرینہ موجود نہیں، تاہم چونکہ اس مخطوطے کے آخری مکتوب موسومہ جیمس تامسن صاحب بہادر گورنر اکبرآباد اور ان خطوط کے درمیان صرف دو خطوں کا فرق ہے اور ان سے پہلے کا خط موسومہ نواب مظفر الدولہ ازروے شواہد ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء کا لکھا ہوا ہے، اس لیے اندازہ یہ ہے کہ یہ دونوں خط بھی تقریباً اسی زمانے میں لکھے گئے ہوں گے۔ دوسرے خط میں چونکہ از اول تا آخر عشرۂ محرم کے دوران مرثیہ خوانی موضوعِ گفتگو رہی ہے، اس بنا پر اسے ماہِ ذی الحجہ کے اواخر کی تحریر ہونا چاہیے۔ محتاط اندازے کے مطابق ہم اسے ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ/جنوری، فروری ۱۸۴۲ء کی نگارش قرار دے سکتے ہیں۔

تعارفی نوعیت کی ان ضروری تفصیلات کے بعد اب یہ چاروں نودریافت خط سطورِ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) خط بہ نام تامسین صاحب سکرترِ اعظم نواب گورنر جنرل بہادر

بہ والا جناب، مکرمت نصاب، صاحب رفیع المناصب، عظیم الشان، قدر افزاے ہواخواہان و امیدگاہِ بے دستگاہاں دام اقبالہٗ وزاد افضالہٗ! بہ ذریعہ تقدیم کورنش و تسلیم عرضہ می دارد و خود چہ عرضہ دارد کہ حالِ بندہ از خداوند نہاں و بندہ را یارا ے آں نیست کہ بہ رہ گزاز نگاہِ رافت خداوندی گردِ رقم تواند انگیخت و با ایں ہمہ کہ آئین بندگی و خداوندی این است، بندگاں را در دِل گفتن و خداونداں را شنودن (اصل = ستودن) نیز آئین است۔ پیش ازیں عرض داشت انگریزی سرکاری بہ پیش گاہ گیتی پناہِ شہریاری و جہاں داری یعنی محکمۂ عالیۂ گورنری فرستادہ است، لیکن چوں رسیدنِ عرض داشت با جنبشِ موکب ہمایونِ گورنری مقارن افتادہ است، بہ رسیدنِ پاسخ آں عریضہ فخر و مباہات را گرمی ہنگامہ رونداده است۔ دریں کہن دیر کہ عالمش نامند، گروہے بندۂ دام و درم است و جمعے بندۂ لطف و کرم۔ جہاں آفریں را جہاں جہاں سپاس کہ عرضہ نگار از فرقۂ ثانیست۔ ہر چند می داند کہ ایں گونہ نگارش (بہ) پاسخ نیرزد و ایں چنین نامہ را جواب نباشد، ہمہ آں می سنجد و باخود آں می سگالد کہ مگر ایں بندگانہ نگارش آں سرکاری گزارش را فرایادِ خاطر خطیر تواند داد و

عریضہ نگار بہ ورودِ توقیعِ وقیع (اصل = وقعی) کہ بہ جوابِ آں عرض داشت رقمِ التفات پزیرد، چشمِ جہاں بیں روشن تواند کرد۔ زیادہ حدِ ادب۔ نیر جاہ وجلال جاودانی فروغ وابدی ضیاباد۔

(۲) رقعہ بہ نام نواب مظفر الدولہ مرزا سیف الدین حیدر خاں بہادر، سیف جنگ

بندہ پرور! امروز بامداداں خیراتی خاں [۱۸] بہ من گفت کہ نواب مظفر الدولہ بہادر سلام می رسانند و می فرمایند کہ فردا آخر روز نواب نوروز علی خاں نزدِ نواب صاحب قبلہ [۱۹] خواہند آمد، اگر تو نیز بیائی، خوشتر باشد۔ ہر چند پاسخ گزاردم وآنچہ می بایست، بہ او (اصل = باز) گفتم لیکن می ترسم (اصل = میرسم) کہ مبادا سخنِ من چناں کہ (اصل = چنانچہ) ہست، گوئندہ باز نگفتہ باشد۔ سخن اینست کہ خاکِ من توانائیِ انگیزشِ غبار ندارد۔ آرے اگر نواب نوروز علی خاں بہ دیدارِ آشفتگاں سرے داشتہ باشند، خانۂ درویش را دررو درباں نیست، ہر قدمے کہ بہ راہ خواہند نہاد، جائے آں بر دیدہ ودل خواہد بود۔ والسلام والاکرام، نامہ نگار اسد اللہ۔

(۳) رقعہ بہ نام نواب معین الدولہ مرزا ذوالفقار الدین حیدر خاں بہادر ذوالفقار جنگ

نوابِ عالی جناب معین الدولہ بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ! دیروز بہ خدمتِ نواب صاحب قبلہ دربارۂ سیدے (اصل = سید) غریب الوطن گزارشے رفت وپشیمانی بار آورد۔ ہمانا آں بےچارہ می خواست کہ بہ دامنِ دولت شما آویزد وبہ سایۂ رافت شما آرامد (اصل = آراید)۔ چوں گنجائش ایں نیست، ناچاری است، بارے ایں قدر خود تواں کرد کہ محروم نماند۔ سخن کوتاہ، ہر چہ از نواب صاحب قبلہ واز شما بدیں سید زادہ خواہد رسید، منتِ آں بر من خواہد بود واجر آں بر آفریدگار۔ والسلام والاکرام۔

(۴) ایضاً: مشفق من! جوشِ گفتار مہرِ خموشی از دہانم برداشت تا چہ گویم واز شما چہ آرزو باجویم۔ گوش بہ من دارید وبشنوید وبدیں گفتہ بگرید۔ نہ آں کنید کہ نشنوید (و) بداں نگردید۔ سخن این است کہ شیخ مشتاق حسین کہ مشتاق تخلص می کنند وریختہ می گویند ونغز می گویند، بہ میانجی گریِ ایں ورق نزدِ شما می رسند وایشاں چنانکہ شاعر اند، مرثیہ ہم می خوانند وچوں دریں شہر آمدہ اند، آں می خواہند کہ دو سہ جا بہ مرثیہ خوانی مقرر شوند وآنجا مرثیہ خوانی کنند۔ لاجرم شمارا باید کہ اول ایشاں را بہ ملازمت نواب صاحب قبلہ وکعبۂ دوجہاں برسانند واز اں جناب فرمان گرفتہ ایشاں را قرار دہید تا خود را دریں عشرہ از متعبانِ امام بارۂ شما شمارند وبہ عہدۂ مرثیہ خوانی حاضر باشند۔ پس ایشاں را بہ

خدمت مخدومِ من و برادرِ خود مظفر الدولہ بہادر برید و عرضہ دارید کہ ایشاں را بہ نظر گاہِ اعتماد الدولہ نواب حامد علی خاں برند تا در انجا نیز منشورِ تقررِ مرثیہ خوانی یا بند و دریں ہر دو جا ہمیں نامہ کہ بہ نامِ نامیِ شماست، نمائید و از جانب من بہ جنابِ عالی بندگی و بہ نواب مظفر الدولہ سلام رسانید۔

چوں ایں ہر دو کار ساختہ شود و نواب صاحب قبلہ بعد شنیدنِ یک دو سوز بہ شما فرمایند وایشاں ملازمِ سرکارِ شما چنانچہ قاعدہ مرثیہ خواناں است، شوند و ہم نواب مظفر الدولہ بہادر ایشاں را باخود برند یا بہ ذریعہ رقعہ خود بہ مقصود رسانند، خاص شما بر ایشاں مہرباں شوید و باخود بردہ باضمیر الدولہ نواب احمد حسین خاں بہادر عرف آغا حیدر[۲۰] آشنائی دہید و ہم دراں امام بارہ (اصل = ایام بارہ) ایشاں را بار و برائے مرثیہ خوانی فرمانِ استوار دہانید و زنہار و زنہار کہ گفتہ ام خود را معذور ندارید و منت بر من نہید و مرادِ در روائی ایں کار مبرم شناسید۔ زیادہ عمر باد و مژدہ عمر۔

حواشی:

۱۔ پنج آہنگ کا یہ نادر قلمی نسخہ جو بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت ہے، عنقریب بہ صورتِ عکس شائع ہوگا۔

۲۔ کلیاتِ نثرِ غالب، مطبع نول کشور لکھنؤ، جنوری ۱۸۷۱ء، ص ۱۲۱

۳۔ مسٹر تھامسن کے اس تقرر کی خبر، دہلی اردو اخبار، کے ۷ر جون ۱۸۴۰ء مطابق ۶ ربیع الثانی ۱۲۵۶ھ کے شمارے میں اس طرح شائع ہوئی تھی:
''مسٹر جی ٹامسن صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ شمالی و مغربی اضلاع کے ہوئے۔''
(ص ۱۲۵)

۴۔ ڈکشنری آف برٹش انڈین ڈیٹس Dictionary of British Indian Dates مطبوعہ لندن، ۱۸۶۶ء، ص ۱۶۸۔ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی نے ''پنج آہنگ' شائع کردہ مجلسِ یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں گورنری کے عہدے پر مسٹر تھامسن کے تقرر کی تاریخ ۲۲ر دسمبر ۱۸۴۳ء بتائی ہے (ص ۶۷۲) لیکن کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ (راقم ان دونوں حوالوں کے لیے جناب کالی داس گپتا رضا کا ممنون ہے)

۵۔ ۲۳ر مارچ ۱۸۳۶ء کی عرض داشت 'حیاتِ غالب کا ایک باب' از ڈاکٹر حسن اختر ملک، شائع کردہ مکتبۂ عالیہ لاہور، ۱۹۸۷ء میں ص ۱۰۶ سے ص ۱۰۹ تک منقول ہے۔ باقی دونوں عرض داشتوں کے حوالے کے لیے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے مضمون 'جاگیرِ غالب میں غالب کی تحریریں' مشمولہ مجلّہ 'نقوش' لاہور، شمارہ نمبر ۱۳۶، بابت دسمبر ۱۹۸۷ء کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ تاریخِ عروجِ سلطنتِ انگلشیۂ ہند مؤلفہ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ، مطبعِ شمس المطابع، دہلی ۱۹۰۴ء، ص ۴

۷۔ تلامذۂ غالب، مالک رام، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۲۴۹

۸۔ یادگارِ غالب (عکسی ایڈیشن)، یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۹۸

۹۔ ایضاً، یادگارِ غالب، حاشیہ ص ۹۸

۱۰۔ دیوان نامی، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، مکتبۂ دبستان، سری نگر، کشمیر ۱۹۷۲ء بہ حوالہ 'غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے' از اکبر حیدری، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۵۲۔

۱۱۔ دستنبو، شائع کردہ صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۔

۱۲۔ بزمِ غالب، ادارۂ یادگارِ غالب کمیٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۔

۱۳۔ اعتماد الدولہ نواب حامد علی خاں پانی پت کی ایک نواحی بستی برست کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد کا پیشہ زراعت تھا۔ حامد علی خاں بچپن ہی میں کسی موقعے پر اپنے والد کی سرزنش سے دل برداشتہ ہو کر گھر سے نکل پڑے اور پا پیادہ لکھنؤ پہنچے، جہاں ان کے ماموں میر فضل علی خاں وزارت کے منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے تین چار برس (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۱ء) اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیت و سرپرستی کی اور اپنی بیٹی حاجی بیگم سے ان کا نکاح کر دیا۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں جب فضل علی خاں کا انتقال ہو گیا تو حاجی بیگم کو بہ طور ترکہ نو لاکھ روپے ملے۔ حامد علی خاں یہ رقم لے کر دہلی چلے آئے اور یہاں عالی شان مکانات، امام باڑہ اور مسجد بنوا کر رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے ایام میں حامد علی خاں کرنال میں تھے۔ ۹ر صفر المظفر ۱۲۷۴ھ/

۲۹ رستمبر ۱۸۵۷ء کو کرنال کے کلکٹر نے دو سو سواروں کے ساتھ ان کے مکان کا محاصرہ کر کے تقریباً نو لاکھ روپے کا سامان لوٹ لیا اور انھیں ان کے بائیس ملازموں کے ساتھ گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا، جہاں انھیں چودہ مہینے تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔ چونکہ دہلی میں ان کے تمام مکانات بھی بہ حق سرکار ضبط ہو چکے تھے، اس لیے رہائی کے بعد انھوں نے محلہ حوض قاضی میں کرائے کے ایک مکان میں سکونت اختیار کی۔

۱۴۔ مکتوب بہ نام میر مہدی مجروحؔ نگاشتہ فروری ۱۸۵۹ء، بہ حوالہ 'غالبؔ کے خطوط' مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلدِ دوم، ۱۹۸۵ء، ص ۵۰۴

۱۵۔ یوسف مرزا کے نام اپریل ۱۸۶۰ء میں لکھے ہوئے ایک خط سے پہلی بار حسین مرزا کی دہلی میں موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ بہ حوالہ 'غالبؔ کے خطوط'، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلدِ دوم، ص ۸۱۷

۱۶۔ تلامذۂ غالب، ص ۲۵۷۔

۱۷۔ سراپا سخن، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۵ء، ص ۹۴۔ عبدالغفور خاں نساخؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ سے صرف مریدی کی نسبت کا ذکر کیا ہے، شاگردی کا حوالہ نہیں دیا، البتہ ان کے صاحب دیوان ہونے کی نشان دہی کی ہے۔ (سخنِ شعرا، شائع کردہ یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۴۳۶)

۱۸۔ مظفر الدولہ یا ان کے والد کے کسی ملازم کا نام معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۔ اس خط میں اور اس کے بعد کے دونوں خطوں میں ''نواب صاحب قبلہ''، ''نواب صاحب قبلہ و کعبۂ دو جہاں'' اور ''جنابِ عالی'' سے مبارز الدولہ مرزا حسام الدین حیدر مراد ہیں۔

۲۰۔ حسین مرزا کے خسر جو عہدِ شاہی میں نظارت کے منصب پر فائز تھے۔

(ماہ نامہ 'آج کل' نئی دہلی، شمارہ اگست ۱۹۹۳ء)

غالبؔ کا ایک نو دریافت فارسی خط

جون سنہ ۲۰۰۱ء میں پاکستان کے معروف غالب شناس لطیف الزّماں خاں صاحب نے جناب مہر الٰہی ندیم (علی گڑھ) کے توسّط سے کسی نامعلوم الاسم مکتوب الیہ کے نام غالبؔ کے ایک فارسی خط کا عکس راقم السطور اور ڈاکٹر کاظم علی خاں کے پاس اس غرض سے ارسال فرمایا کہ ہم لوگ اس سے مستفید ہوں اور اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ راقم السطور نے ۲۰/جون سنہ ۲۰۰۱ء کو ایک خط کے ذریعے لطیف صاحب سے اس سلسلے میں بعض توضیحات کی درخواست کی جس کے جواب میں انھوں نے مجملاً صرف یہ تحریر فرمایا کہ یہ خط انھیں جن صاحب سے ملا تھا، وہ حیدر آباد میں ایکزیکیوٹو انجینیر تھے اور اب وہ غالباً اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس کے بعد راقم نے بعض داخلی و خارجی شواہد و قرائن کے سہارے اس کے مکتوب الیہ کے تعیّن کی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو یہ مناسب خیال کیا کہ جب تک اس مسئلے کا کوئی قرینِ قیاس حل سامنے نہ آئے، اس خط کے بارے میں محض رسمی گفتگو کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہ کیا جائے۔ اس دوران جناب مہر الٰہی ندیم نے ملتان سے موصول شدہ اس خط کی ایک نقل جناب مشتاق احمد تجاروی کو بھی فراہم کر دی جو غالبؔ اور غالبیات سے دلچسپی رکھتے ہیں

اور جن کی اس موضوع سے متعلق تحریریں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ موصوف نے خط کے تمام داخلی و خارجی قرائن کے برخلاف نہ جانے کس بنیاد پر یہ فیصلہ کر دیا کہ اس کے مخاطب معتمد الدولہ آغا میر کے صاحبزادے نواب سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ ہیں جنھوں نے کان پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور جن کے مرزا غالبؔ سے روابط تھے۔ مشاق صاحب کی یہ دریافت جس مضمون کے توسط سے سامنے آئی، وہ ''مرزا غالبؔ کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط'' کے عنوان سے ماہنامہ ''آج کل'' کے فروری سنہ ۲۰۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون تمہید کے علاوہ مندرجہ ذیل چار حصوں پر مشتمل ہے:

(۱) اصل فارسی خط

(۲) خط کا اردو ترجمہ

(۳) مکتوب الیہ (سید باقر علی خاں) کے حالات

(۴) نواب باقی محمد خاں کے حالات

تمہید کے تحت مختصراً زیرِ بحث خط تک رسائی کا ذکر کرنے کے بعد اس کے متعلقات کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی گئی ہے:

> ''اس خط کے مکتوب الیہ معتمد الدولہ آغا میر کے بیٹے نواب سید باقر علی خاں ہیں۔ مرزا غالبؔ نے بعض خطوط میں ان کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ان کے نام یہ واحد دستیاب خط ہے۔ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ الدولہ (کذا) نواب باقی محمد خاں (نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر اور نواب سلطان جہاں بیگم کے والد) سے بھی مرزا غالبؔ کی مراسلت رہی، بلکہ یہ خط انھی کے بارے میں ہے۔''

چوں کہ کسی تحریر کے مالہٗ و ماعلیہ پر بامعنی اور نتیجہ خیز گفتگو کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا اصل متن پیشِ نظر ہو، اس لیے یہ خط مِن و عَن سطورِ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

> ''کرم گسترا، بندہ پرورا دی روز کہ یکشنبہ بست و چہارمِ اگست سنہ ۱۸۵۶ عیسوی بود، نامۂ شما بہ من رسید۔ ورق را نورد از ہم کشادم و

خواندم، نوشتہ یافتم کہ نواب امراو دُولہہ بہ سبب ممانعتِ سرکارِ انگریزی نامہ از نامِ خود بہ شمانہ نگاشتہ اند و ایں ہنڈویِ پنجاہ روپیہ از بہرِ خریدنِ کتب فرستادہ اند۔ بہ شما آگہی می دہم کہ ہنڈوی در نوردِ ورق نہ بود۔ بر شما گمانِ استہزا نہ تواں کرد۔ ہمانا ہنگام نوردیدنِ نامہ فرو پیچیدنِ ہنڈوی از یاد رفت و آں کاغذ ہماں جا ماند و خوب شد۔ اگر می رسید، من آں رامی بوسیدم و بر سر و چشم ہمی نہادم و باز پس می فرستادم۔ باید آں کاغذ را بجویند و بہ نواب صاحب دہند و بگویند کہ ایں را بہ ساہوکار دہند و زرے کہ بہ وے دادہ اند، از وے باز گیرند۔ زنہار، صد زنہار، دیگر بار ایں کار نہ کنند و ایں شعر از جانب من پیشِ نواب صاحب بخوانند:

ما شمارا اہلِ علم انگاشتیم
خود غلط بود، انچہ ما پنداشتیم

ماجرا اینست کہ کما بیش سہ چہار ماہ است کہ روزے سرہنگِ ڈاکِ انگریزی آمد و خطے بہ من داد۔ دیدم کہ عنوانش بہ نامِ من است و نامِ کاتب نظیر الدولہ نواب باقی محمد خاں بہادر عرف امراو دولہہ مرقوم است۔ در نامہ طلبِ مجموعۂ نظم و نثرِ خود و انطباعِ آں در بھوپال مشاہدہ کردم۔ چوں گفتۂ من نزدِ من نہ می باشد، روزِ دگر جوابِ نامۂ نواب صاحب نبشتم و بہ ڈاک فرستادم۔ پس از روزے چند یک نسخہ کہ بہ مہرِ نیم روز موسوم است، فراچنگ آمد، بہ سبیلِ پارسل از روے احتیاط بیرنگ رواں داشتم۔ چوں عیدِ اضحیٰ آمد، دو قصیدہ کہ من در مدحِ شہریار و ولی عہد نوشتہ بودم و در مطبعِ سلطانی طرازِ انطباع یافتہ بود، بہ خدمتِ نواب صاحب ارمغاں فرستادم و بہ بندِ آں افتادم کہ ہیچ

آہنگ و دیوانِ فارسی و دیوانِ اردو نیز فرستم۔ اکنوں کہ نواب صاحب ارمغانِ مارا ارمغاں نہ دانستند و مارا کتاب فروش پنداشتند، از عزیمتِ خود پشیماں گشتیم۔ بہ حیرتم کہ نواب صاحب در آغاز چہ فہمیدہ بودند و انجامِ کار حضرت را چہ در ضمیر گزشت۔ دراں زمانہ کہ بہ من نامہ نوشتند، از جانب اہالیِ سرکار ممنوع نہ بودند و ہمیدوں ایں چنیں حکم صدور یافتہ است۔ فرستادنِ ہنڈوی بے جا و عذر نامہ نہ نوشتن، در صورتے کہ پیش ازیں نوشتہ باشند، نامسموع۔ بہر حال پدید آمد کہ نواب صاحب چناں کہ سخن را نہ فہمند، آدم را نیز نہ می شناسند و مارا با چنیں کس کار نیست۔ والسّلام مع الاکرام، از اسد اللہ، نگاشتہ و رواں داشتۂ دوشنبہ، بست و سیوم ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۲ و بست و پنجمِ اگست سنہ ۱۸۵۶ء۔"

خط کے مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ نواب شاہ جہاں بیگم رئیسۂ بھوپال کے شوہر نظیر الدولہ نواب باقی محمد خاں عرف امراؤ دولھا نے ۲۵ راگست سنہ ۱۸۵۶ء سے اندازاً تین یا چار مہینے قبل غالبؔ کو ایک خط لکھ کر ان سے ان کا "مجموعۂ نظم ونثر" طلب کیا تھا اور بھوپال میں اس کے انطباع کی خواہش ظاہر کی تھی۔ چوں کہ غالبؔ اپنا کلامِ نظم و نثر خود جمع کرنے اور اپنے پاس محفوظ رکھنے کے عادی نہیں تھے، اس لیے انھوں نے دوسرے ہی روز اس کا مناسب جواب لکھ بھیجا۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد "مہرِ نیم روز" کا ایک نسخہ ان کے ہاتھ آ گیا تو وہ انھوں نے بہ سبیلِ پارسل نواب صاحب کو بھیج دیا۔ بعد ازاں بادشاہ اور ولی عہد کی مدح کے دو قصیدے جو عیدِ اضحیٰ کے موقعے پر انھیں پیش کیے گئے تھے اور مطبعِ سلطانی میں طبع ہوئے تھے، "بہ طورِ ارمغاں" ان کی خدمت میں ارسال کیے۔ ان تحائف کی رسید میں غالبؔ کو جو خط ملا، وہ نواب صاحب کی بجائے ان کے کسی پیش دست کا لکھا ہوا تھا اور اس کی تاویل یہ کی گئی تھی کہ سرکارِ انگریزی کی عائد کردہ پابندی کی بنا پر نواب صاحب بہ نفسِ نفیس خط لکھنے سے معذور ہیں۔ یہ بات غالبؔ کے گلے نہیں

اتری۔ وہ حیرت میں تھے کہ محض چند ماہ پہلے جب نواب صاحب نے خط لکھا تھا، اس وقت تو اہالیِ سرکار کی طرف سے ایسی کوئی بندش نہ تھی، پھر اب یہ کیسا حکم صادر ہوا ہے کہ وہ کسی سے براہِ راست مراسلت نہیں کر سکتے۔ ان کی انا کو اس بات سے بھی ٹھیس پہنچی تھی کہ اس خط کے ساتھ کتابوں کی خریداری کی غرض سے پچاس روپے کی ہنڈی بھی بھیجی گئی تھی جو اتفاقاً خط میں ملفوف ہونے سے رہ گئی تھی۔ ان کے نزدیک یہ اس بات کی علامت تھی کہ نواب صاحب انھیں سخنور نہیں، کتاب فروش سمجھتے تھے۔

ان تفصیلات سے بہ خوبی ظاہر ہے کہ وہ خط جس کے جواب میں غالبؔ نے یہ خط تحریر کیا ہے، لازماً بھوپال ہی سے لکھا گیا ہوگا اور اس کا لکھنے والا یقینی طور پر کوئی ایسا شخص ہوگا جسے نواب باقی محمد خاں کا تقرب اور اعتماد حاصل ہوگا۔ مشتاق صاحب نے نظیر الدولہ نواب باقی محمد خاں نصرت جنگ اور نواب سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ کے جو حالات تحریر فرمائے ہیں، ان سے ان دونوں حضرات کے درمیان کسی قسم کی قربت یا رابطے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خط جس زمانے میں لکھا گیا تھا، نواب باقی محمد خاں بھوپال میں اور نواب باقر علی خاں کان پور میں فروکش تھے۔ دوسرے تمام دلائل و قرائن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اس بعدِ مکانی ہی کی بنا پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نواب باقر علی خاں کا نواب باقی محمد خاں کی طرف سے کسی کو خط لکھنا یکسر بعید از امکان ہے، اس لیے وہ غالبؔ کے اس خط کے مکتوب الیہ نہیں ہو سکتے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا، نواب باقی محمد خاں نواب شاہ جہاں بیگم رئیسۂ بھوپال کے شوہر تھے۔ نواب صاحب موصوف ماہ شوال سنہ ۱۲۳۸ھ (جون، جولائی سنہ ۱۸۲۳ء) میں پیدا ہوئے تھے۔[۱] شاہ جہاں بیگم ۶؍ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۵۴ھ (۳۰؍ جولائی سنہ ۱۸۳۸ء) کو پیدا ہوئیں۔[۲] ان دونوں کے عقدِ نکاح کی رسم ۱۱؍ ذی قعدہ سنہ ۱۲۷۱ھ (۲۶؍ جولائی سنہ ۱۸۵۵ء) کو ادا ہوئی۔[۳] اس وقت نواب صاحب کی عمر بتیس سال اور بیگم صاحبہ کی عمر سترہ سال تھی۔ دونوں کی عمروں میں پندرہ سال کے اس فرق کے علاوہ یہ نواب صاحب کا دوسرا نکاح تھا۔ ان کی پہلی بیوی بہ قیدِ حیات تھیں۔ علاوہ بریں ایک حرم بھی محل میں رونق افروز تھی اور ان دونوں سے کئی اولادیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایک رئیسۂ وقت کا اس طرح اپنی عمر سے کافی بڑے اور صاحبِ ازواج و

اولاد شخص کے حبالۂ نکاح میں آنا جو بہ ظاہر ایک غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے، دراصل ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ نواب شاہ جہاں بیگم کی والدہ نواب سکندر بیگم جب اپنے والد کی وفات کے بعد وارثِ تخت و تاج قرار پائیں تو ان کی عمر صرف ڈیڑھ سال تھی۔ کمپنی بہادر کی سرکار نے ان کی مسند نشینی کی تصدیق کرتے ہوئے ان کی والدہ قدسیہ بیگم کو ریجنٹ (کارگزار حکمراں) مقرر کر دیا اور یہ شرط عائد کر دی کہ جب سکندر بیگم کی شادی ہو جائے گی تو ان کے شوہر والیِ ریاست قرار پائیں گے۔ جمعہ، ۱۸ر ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۷ر اپریل سنہ ۱۸۳۵ء) کو سکندر بیگم کی شادی نواب جہاں گیر محمد خاں سے ہو گئی۔ بعد ازاں جب وہ عمر کی مطلوبہ منزل کو پہنچ کر از روئے قانون خود اختیاری کی مستحق ہو گئیں تو قدسیہ بیگم کی ریجنسی ختم کر کے حسبِ قرار داد نواب جہاں گیر محمد خاں کی فرماں روائی کا اعلان کر دیا گیا۔ سکندر بیگم نے بہ درجۂ مجبوری اس فیصلے کو تسلیم تو کر لیا تھا لیکن وہ اس سے خوش نہیں تھیں۔ یہی سبب تھا کہ نواب جہاں گیر محمد خاں سے ان کے تعلقات زیادہ خوش گوار نہیں رہے۔ ۲۸ر ذی قعدہ سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۰ر دسمبر سنہ ۱۸۴۴ء) کو جہاں گیر محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔[۵] اس کے بعد نواب شاہ جہاں بیگم جن کی عمر اس وقت ساڑھے چھ سال تھی، وارثِ سلطنت قرار پائیں اور کمپنی بہادر نے ان کی جانشینی کو باقاعدہ منظوری عطا کر دی۔ لیکن ریاست کی اصل حکمراں سکندر بیگم تھیں، نواب جہاں گیر محمد خاں نہ تھے، اس لیے جب انھیں بہ حیثیت ریجنٹ اپنی انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملا اور کمپنی بہادر کے حکام بھی ان کے حسنِ انتظام اور کارکردگی کے قائل ہو گئے تو انھوں نے اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ بالآخر گورنمنٹ نے اصولی طور پر ان کے استحقاق کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ نواب شاہ جہاں بیگم پر چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے بھی اپنی والدہ کے حق میں دست برداری سے اتفاق کر لیا تو وائسرائے نے ۶ر جمادی الاخریٰ سنہ ۱۲۷۶ھ (۳۱ر دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء) کو باضابطہ فرمان جاری کر کے سکندر بیگم کی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور ضروری کارروائیوں کے بعد یکم مئی سنہ ۱۸۶۰ء کو ان کی مسند نشینی کی رسم ادا کر دی گئی۔[۶]

سکندر بیگم نے اپنے شوہر کے دورِ حکمرانی میں جن حق تلفیوں کا سامنا کیا تھا، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار ہو، اس لیے انھوں نے بہ حسنِ تدبیر سرکار سے یہ شرط تسلیم کرا لی کہ شاہ جہاں بیگم کی شادی کے بعد کاروبارِ سلطنت میں ان کے شوہر کا

کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔ مزید احتیاط کے پیشِ نظر انھوں نے ان کے شریکِ زندگی کے طور پر کسی ایسے شخص کے انتخاب کا فیصلہ کیا جو برسرِ اقتدار خاندان سے نسبی تعلق نہ رکھتا ہو اور جس کے اوضاع واطوارِ ظاہری خوبوے سلطانی سے پاک اور سعادت مندی و وفاشعاری سے مملو ہوں۔ کافی غور و خوض کے بعد قرعۂ فال بخشی باقی محمد خاں نصرت جنگ کے نام نکلا اور منگنی کی رسم ادا ہونے کے آٹھویں دن نواب شاہ جہاں بیگم ان کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دی گئیں۔ اس طرح وہ ایک معزز عہدے دار کے درجے سے بلند تر ہو کر ''نظیر الدولہ امراؤ دولھا'' کے خطاب کے ساتھ خاندانِ شاہی کے ایک فرد بن گئے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، باقی محمد خاں کی شادی ۱۱رذی قعدہ سنہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۲۶رجولائی سنہ ۱۸۵۵ء کو ہوئی تھی۔ غالب کا زیرِ بحث خط ۲۳رذی الحجہ سنہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۵راگست سنہ ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ نواب صاحب کا خط انھیں اس سے کم و بیش تین چار مہینے پہلے موصول ہوا تھا، اس بنا پر سرسری اندازے کے مطابق اسے شادی سے نو، دس مہینے بعد کی تحریر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے کے دفتری نظام اور رسل و رسائل کی دشواریوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے اس شادی کے انعقاد سے متعلق باضابطہ اطلاع نامے کے ریاست کے دفتر سے پہلے ایجنٹ براے گورنر جنرل اور پھر گورنر جنرل کے دفتر تک پہنچنے، طے شدہ ضوابط کے مطابق ان دونوں جگہوں پر ضروری کارروائی ہونے، اس کے بعد صادر شدہ احکام و ہدایات کے سلسلہ بہ سلسلہ بھوپال تک آنے میں یقیناً آٹھ، دس مہینے لگ گئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ریاست کے نظم و نسق سے شوہرِ رئیسہ کی بے تعلقی اور اسے عملی شکل دینے کے لیے مجوزہ مختلف النوع، پابندیوں کا نفاذ وائسراے کے ان احکام کے صدور کے بعد ہی ہوا ہوگا۔

حالات و واقعات کی ان تفصیلات میں غالب کے اس استعجاب کا جواب موجود ہے کہ تین چار مہینے پہلے تک تو نواب صاحب کے خط لکھنے پر کوئی پابندی عائد نہ تھی، پھر اب ایسا کیا ہوا کہ بہ حکمِ سرکار ان سے یہ اختیار سلب کر لیا گیا۔ مرزا صاحب نے اس سلسلے میں مکتوب نگار کے بیان کردہ جس عذر کو محض ایک بہانہ سمجھا اور ''نامسموع'' گردانا ہے، بھوپال کی سیاسی تاریخ ایک واقعے کے طور پر اس کی صداقت کی گواہ ہے۔

حسنِ اتفاق سے ۱۲راپریل سے ۲رمئی سنہ ۲۰۰۷ء تک بھوپال میں قیام کے دوران اس

خط سے متعلق مختلف تصفیہ طلب امور کے حوالے سے ریاست کی مختلف تاریخیں، فرماں رواؤں کی سوانح عمریاں اور شعرا کے تذکرے اطمینان کے ساتھ دیکھنے اور ان سے ضروری معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا، لیکن تمام تر سعی و کاوش کے باوجود یہ معما حل نہ ہو سکا کہ پابندی کے بعد نواب باقی محمد خاں کی طرف سے مراسلت و مکاتبت کی خدمت کس شخص کے سپرد تھی۔ البتہ قیاس کی رہنمائی میں جس ایک شخص پر بار بار نگاہ ٹھہری، وہ مولوی امداد علی امداؔد خیر آبادی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف ریاست کے نہایت معتمد علیہ اور آزمودہ کار ملازمین میں سے تھے اور خاندانِ شاہی کے کئی افراد کے ذاتی عملے میں شامل رہ چکے تھے۔ نواب شاہ جہاں بیگم نے ''تاج الاقبال'' کے دفترِ سوم کی آخری فصل ''ذکرِ کار پردازانِ خیر خواہ و ملازمانِ فضیلت پناہ'' کے لیے مخصوص کی ہے۔ اس میں کل سات اشخاص کا تذکرہ ہے جن میں مولوی صاحب بھی شامل ہیں۔ ان کا تعارف بیگم صاحبہ نے ان الفاظ میں سپردِ قلم کیا ہے:

''مولوی امداد علی امداؔد، متوطنِ خیر آباد، در عہدِ مختاری نواب قدسیہ بیگم کوتوالِ بھوپال بود۔ بعد ازاں در سلکِ مصاحبینِ قبلہ گاہ مرحوم آبرو افزود۔ پس ازاں چندے در جیرہ خوارانِ مادرم آسود۔ زاں بعد کار پردازیِ آستانۂ نواب باقی محمد خاں بہادر مرحوم نمود۔ باز مستغنی شد و در بر روے خود بست و فارغ البال در گوشۂ عزلت نشست۔ از سرکارِ قدسیہ بیگم در زمرۂ اربابِ استحقاق قدرے تنخواہ می یافت۔ در اوائلِ سنہ ۱۲۸۵ ہجری بہ عالمِ بقا شتافت۔'' [۷]

نام کے ساتھ تخلص کے التزام سے یہ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب شاعر بھی تھے۔ چناں چہ شاہ جہاں بیگم نے اس تعارف کے بعد نمونۂ کلام کے طور پر گیارہ اشعار کی ایک مکمل غزل اور نواب سکندر بیگم کے مدحیہ قصیدے کے پانچ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ ''تاج الاقبال'' کے علاوہ نواب نور الحسن خاں کے مرتبہ شعرائے فارسی کے تذکرے ''نگارستانِ سخن'' میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ نواب صاحب نے تعارف میں الفاظ کے فرق کے ساتھ بلا کم و کاست وہی تمام باتیں دوہرا دی ہیں جو ''تاج الاقبال'' میں درج ہیں۔ انتخابِ کلام چار غزلوں کے پندرہ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ قیاس یہ ہے کہ امداؔد صرف فارسی ہی میں فکرِ شعر کرتے تھے۔ غالباً اسی لیے نواب نور الحسن خاں اور ان کے چھوٹے بھائی نواب علی حسن خاں کے مرتب کیے ہوئے شعرائے اردو کے تذکرے ''طورِ کلیم'' اور ''بزمِ سخن'' ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ فارسی زبان پر ان کی قدرت اور

معیارِ کلام کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

آغشتہ ای از خونِ شہیداں کفِ پارا
بدنام عبث ساختہ ای رنگِ حنا را
تا بلہوساں در ہوسِ خام نیفتند
در خلوتِ خود بار مدہ اہلِ ہوا را
تنہا نہ دلم خوں شدہ از کاوشِ مژگاں
بالائے تو ہم بر سرم آورد بلا را

کو فتنہ کہ از چشمِ تو برپا شدنی نیست
کو دیدہ کہ از دردِ تو دریا شدنی نیست
سودا زدۂ زلفِ تو ہر شیخ و برہمن
آں کیست کہ در عشقِ تو رسوا شدنی نیست
ایں عقدۂ لا حل کہ بہ کامِ دلم افتاد
جز ناخنِ شمشیرِ قضا وا شدنی نیست

شعلۂ ادراک روشن در دماغم می کند
ساقیِ ما روغن از مے در چراغم می کند
دورِ گردوں پیشِ ہر کس بادہ می ریزد بہ جام
چوں رسد نوبت بہ من، خوں در ایاغم می کند

نواب باقی محمد خاں کی سرکار سے کارپرداز یا معاونِ ذاتی کی حیثیت سے وابستگی اور فارسی زبان سے خصوصی شغف کی بنا پر ہمارا خیال یہ ہے کہ یہی مولوی امداد علی امدآد خیرآبادی غالؔب کے اس خط کے مکتوب الیہ ہیں۔ خیرآباد سے وطنی نسبت اس قیاس کو مزید تقویت بخشتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ مولانا فضلِ حق خیرآبادی سے کسی قسم کی قرابت رکھتے ہوں۔ غالؔب کے اس خاندان کے کئی افراد سے قریبی روابط تھے۔ ان قیاسات کے صد فی صد درست ہونے

پر اصرار نہیں کیا جا سکتا، تاہم نواب باقی محمد خاں کے اردگرد مولوی امداد علی کے علاوہ کوئی اور ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو ان سے زیادہ اس شرفِ تخاطب کی مستحق ہو۔

قیامِ بھوپال کے دوران پیشِ نظر مضمون کے لیے ضروری مواد کی فراہمی کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ جناب لطیف الزّماں خاں سے ایک بار پھر رجوع کیا جائے اور زیرِ بحث خط کے حصول سے متعلق مزید تفصیل نیز مشتاق صاحب کے موقف کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی جائے۔ موصوف نے اس سلسلے میں میرے مکتوب مورخہ ۲۳ر جون کے جواب میں ۹ر جولائی سنہ ۲۰۰۷ء کو جو مفصل خط تحریر فرمایا، اس کے مفیدِ مطلب اجزا حسبِ ذیل ہیں:

''ماہ نامہ ''آج کل'' دہلی کا فروری سنہ ۲۰۰۶ء کا شمارہ میں نے نہیں پڑھا...... میں مشتاق صاحب سے قطعی متفق نہیں کہ اس خط کے مخاطب معتمد الدولہ آغا میر کے بیٹے باقر علی خاں ہیں۔

زمانۂ طالب میں مرحوم پروفیسر عزیز الدین صاحب میرے کرم فرما تھے۔ ۸ؔ وہ فارسی کے استاد تھے۔ بائیس سال لاڑکانہ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے گزارے۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ میرا پہلا اور آخری عشق غالبؔ ہے۔ وہ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے کہ مجھے کوئی ایسی نادر تحریر غالبؔ کی مرحمت فرمائیں جو ہمیشہ یاد رہے۔

حیدرآباد (سندھ) کے قریب چھوٹا سا قصبہ کوٹری ہے، وہاں شیخ عبدالغفار صاحب رہتے تھے۔ یہ صاحب پیشے سے انجینیر تھے اور انھیں نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا۔ مرحوم عزیز الدین صاحب نے غالبؔ کا غیر مطبوعہ خط انھی سے جولائی سنہ ۱۹۸۴ء میں حاصل کیا اور مجھے مرحمت فرمایا۔

یہاں مجھے کوئی صاحب ایسے نہ ملے جو یہ بتا سکتے کہ خط کا مخاطَب کون ہے، اس لیے اس کا عکس آپ کو بھیجا تھا۔''

یہ تفصیلات پیش کر دینا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ممکن ہے قارئین میں سے کوئی صاحب شیخ عبدالغفار مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے ہوں اور وہ یہ بتا سکیں کہ شیخ صاحب موصوف کے خاندان کے کسی بزرگ، ریاست بھوپال، نواب باقی محمد خاں اور مرزا غالبؔ کے درمیان کس قسم کے رشتے اور روابط تھے۔ اگر اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوتی ہے اور کوئی نیا نکتہ سامنے آتا

ہے تو یہ طے کرنا آسان ہو جائے گا کہ فی الواقع غالبؔ کے زیرِ بحث خط کا مکتوب الیہ کون ہے۔

حواشی:

۱۔ یہاں غالبؔ سے سہو ہوا ہے۔ یہ قصائد عید الفطر کے موقعے پر پیش کیے گئے تھے جو اس سال از روے تقویم ۵/ جون سنہ ۱۸۵۶ء کو واقع ہوئی تھی۔ اس کے ایک مہینا پانچ دن کے بعد ۱۰/ جولائی سنہ ۱۸۵۶ء کو ولی عہدِ سلطنت میرزا غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ عید الاضحیٰ ۱۲/ اگست سنہ ۱۸۵۶ء کو یعنی مرزا فخرو کی وفات کے ایک مہینا دو دن بعد ہوئی تھی۔

۲۔ تذکرۂ باقی از نواب سلطان جہاں بیگم، مطبعِ سلطانی بھوپال، سنہ ۱۹۱۵ء، ص ۲۸

۳۔ حیاتِ شاہجہانی از نواب سلطان جہاں بیگم، مطبعِ مفیدِ عام آگرہ، سنہ ۱۹۱۴ء، ص ۸

۴۔ حیاتِ شاہجہانی، ص ۷ و تذکرۂ باقی، ص ۴۳

۵۔ حیاتِ شاہجہانی، ص ۸

۶۔ حیاتِ شاہجہانی، ص ۱۲

۷۔ تاج الاقبال، تاریخِ ریاست بھوپال، از نواب شاہ جہاں بیگم، مطبعِ نظامی کان پور، سنہ ۱۲۹۰ھ، ص ۱۱۲

۸۔ یہ بیان کسی قدر مبہم ہے۔ ٹیلی فون پر رابطے کے دوران لطیف صاحب نے بتایا کہ زمانۂ طالب علمی میں عزیز الدین صاحب ان سے دو سال سینیر تھے۔

غالبؔ کا ایک فارسی خط اور ان کا سفرِ فیروز پور

غالبؔ تاریخ و تحقیق سے دلچسپی رکھنے کے باوجود تاریخی و تحقیقی شعور سے یکسر عاری تھے۔ ان کے اندر اپنے رشحاتِ قلم کو محفوظ رکھنے اور نقل و اشاعت کے ذریعے دور دراز کے قدر شناسوں اور مستقبل کے قارئین تک پہنچانے کا داعیہ بے حد قوی تھا لیکن اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ بیانِ واقعات کے معاملے میں کسی تحریر کو کتنا واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کی تحریروں بالخصوص فارسی کے خطوں میں ان کی زندگی کے لاتعداد واقعات اور ان کی مصروفیات و مشاغل کی بے شمار تفصیلات محفوظ ہیں لیکن ان میں غالب اکثریت ان بیانات کی ہے جن کے ساتھ تاریخیں اور سنہ مذکور نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات کسی اہم واقعے سے واقفیت کے باوجود، اس معمّے کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ کب پیش آیا۔ بے یقینی اور لاچاری کی اس کیفیت کے ساتھ ناگزیر طور پر قیاس آرائیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کی تان زیادہ تر پراگندہ خیالی اور اختلافِ رائے پر ٹوٹتی ہے۔ تحریروں کے اس زمرے میں ان کا وہ خط بھی شامل ہے جو انھوں نے فیروز پور جھرکا سے اپنے محبِ خاص مولانا فضل حق خیر آبادی کے نام لکھا تھا۔

غالبؔ کی نگاہ میں اس خط کی وقعت اس اعتبار سے زیادہ تھی کہ یہ صنعتِ تعطیل میں لکھا ہے اور فارسی میں ان کی نثر نگاری و انشا پردازی کا ایک مثالی نمونہ ہے لیکن غالب شناسوں کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کا اصل سبب یہ ہے کہ اس سے غالب کے سفرِ فیروز پور کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے جو ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے اور بعد کے کئی برسوں کے واقعات کے سلسلے میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔

غالبؔ نے اس خط کو ''پنج آہنگ'' یا ''سبدِ باغ دودر'' میں اپنے دوسرے فارسی خطوں کے ساتھ ایک مستقل بالذات مکتوب کی حیثیت سے شامل کرنے کی بجائے ''خاتمۂ گلِ رعنا'' اور مولوی محمد علی خاں صدر امینِ باندہ کے نام کے ایک خط میں اپنی فارسی نثر کے نمونے کے طور پر نقل کیا ہے۔ ان دونوں مقامات پر اس کے سیاق و سباق سے اس کے زمانۂ تحریر کے بارے میں جو اطلاعات ملتی ہیں، وہ بادی النظر میں باہم مطابقت نہیں رکھتیں۔ ''خاتمۂ گل رعنا'' میں غالب کا بیان ہے:

> ''روزے بود و روزگارے کہ بہ فضاے جنت کدۂ دہلی بال افشاں بودم... نہ بر چہرۂ من از روزگار گردے و نہ در دلِ سپہر از من غباری.... ناگرفتہ... دل از آسودگی بر آشفت و.... شوقِ آوارگی از شش جہت آغوش بہ روے دل کشود۔ ناچار نخست بہ عزمِ زمیں بوسِ عم مغفور.... نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ بہ پاے تختِ آں مرزبانِ باراے و فرہنگ.... پاے خاکی کردم۔ از بس کہ سراسیمگی سراپاے دل را فرا گرفتہ بود، از بزرگانِ وطنِ پدرود نا شدہ بہ راہ افتادم۔ ہر چند ازاں مردم شرمندۂ مہر و وفاے نہ بودم کہ در حسرتِ فوتِ فرصتِ تودیع پشتِ دستے بہ دنداں بایستے گزید، لیکن پارسا گوہر دوستے و آشنا پروریارے داشتم، چوں من بر من مہرباں و چوں دل در سینہ جا گزیں... مستغرقِ تماشاے جمالِ وجہِ مطلق، مولوی حافظ محمد فضلِ حق کہ از وے دستوری ناخواستہ سفر کردن بہ مذاقِ شوقم، ناگوار افتاد.... دل بہ درد آمد و جاں بہ یغماے اندوہ رفت۔ چوں کارواں بہ

منزل رسید و رہرو از رنجِ راہ بر آسود، کتابتے در صنعتِ تعطیل بہ خدمتش فرستادہ شد..... چوں سررشتہ ہر کار بہ زمانے باز بستہ است، دراں کشاکش از بند نہ توانستم بدر جست۔ بے خودی گریبانم گرفت و بازم بہ دہلی آورد۔ روزگارے دراز بہ خاک نشینی سپری شد و چرخ گردندہ بسی بر گرد ایں خاکداں بگشت کہ غنودگی ہائے مرا بامداد رسید و مرغ سحر خواں شوقِ نو بر آورد..... شوقِ سلسلہ خاز نجیر خودداری گسیخت و ..... پائے خوابیدہ بہ رفتار آمد..... ہر چند مرا بایستے بہ کلکتہ رسید و چارۂ لب تشنگیِ خویش از محیط جست۔ اما ازاں جا کہ عنانِ جنبشِ ذراتِ کائنات بہ کفِ اضطراب سپردہ اند..... نخست اتفاق ورود بہ لکھنؤ افتاد..... [۱۱]

اس تفصیل و توضیح کا ماحصل یہ ہے کہ غالب بہ قول خود دہلی میں سکون و عافیت کی زندگی گزار رہے تھے کہ ناگاہ شوقِ آوارگی نے سر اٹھایا اور انھیں پہلے مرحلے میں نواب احمد بخش خاں کے در دولت تک پہنچا دیا۔ چوں کہ وہ سراسیمگی کے عالم میں اس سفر پر نکلے تھے، اس لیے اپنے بزرگوں اور دوستوں سے وداعی ملاقات بھی نہ کر پائے تھے۔ خاص طور پر مولانا فضل حق سے نہ مل پانے کا انھیں بے حد افسوس تھا، چنانچہ منزل پر پہنچ جانے اور صعوباتِ سفر سے آسودہ ہو جانے کے بعد انھوں نے مولانا موصوف کے نام بہ طورِ معذرت صنعتِ تعطیل میں ایک خط لکھا۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھوں نے آگے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دہلی واپس چلے آئے۔ اس واقعے پر مدتِ دراز گزر جانے کے بعد یہ جنونِ آوارگی ایک بار پھر تازہ ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس بار وہ بہ راہِ راست کلکتہ پہنچتے مگر وقت اور حالات کی رو انھیں کلکتے سے پہلے لکھنؤ لے گئی۔

مولوی محمد علی خاں کے نام کے خط میں اس مکتوب کی شانِ نزول اس طرح بیان کی گئی ہے:

"در مبادیِ بسیچ سفرِ مشرق بہ فیروز پور کہ جاگیر عمو صاحب قبلہ..... نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ است، بہ خدمتِ عمِ ممدوح گزرانیدہ بودم۔ فخر العلما مولوی فضلِ حق نام دوستے در دار الخلافہ تمکن داشت

کہ من از فرطِ استعجال فرصتِ تودیع نہ یافتہ (وازو) پدرود نا شدہ بہ منزل مقصود شتافتہ بودم۔ دراں جا رسیدہ پوزش نامہ بہ خدمتِ کثیر الافادتش نگاشتم و دراں (صنعت) تعطیل مرعی داشتم''۔[۲]

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب جب مشرق یعنی کلکتے کے سفر کا ارادہ کر کے دہلی سے نکلے تو شروع میں انھوں نے کچھ دن فیروز پور میں نواب احمد بخش خاں کے ہاں گزارے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولانا فضل حق کے نام یہ خط لکھا تھا۔ یہ بیان ''خاتمۂ گل رعنا'' کے بیان سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں فیروز پور سے دہلی واپس آنے اور ایک طویل مدت یہاں گزارنے کے بعد بادی النظر میں دہلی سے بہ راہ راست کلکتے کے سفر پر روانہ ہو جانے کا ذکر تھا جب کہ اس بیان میں کلکتے کے لیے آمادگیِ سفر کے آغاز میں فیروز پور میں قیام کی بات کہی گئی ہے۔ مرزا صاحب کی اس عرضداشت کے بعض اندراجات سے بھی جو انھوں نے کلکتے پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ۲۸ / اپریل ۱۸۲۸ء کو گورنر جنرل کے حضور میں پیش کی تھی، کچھ اسی قسم کا تاثر ملتا ہے کہ غالب فیروز پور پہنچنے کے بعد قرض خواہوں کے خوف کی وجہ سے وہاں سے دہلی واپس نہ جا سکے تھے اور کان پور، لکھنؤ اور باندہ ہوتے ہوئے سیدھے کلکتے چلے گئے تھے۔ رودادِ سفر کے بیان میں نظام الاوقات اور ترتیبِ مراحل کے اس فرق نے غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ ان اہلِ علم میں سے کوئی بھی شخص اس بارے میں شرحِ صدر کے ساتھ کچھ کہنے کے موقف میں نہیں کہ غالب صرف ایک بار فیروز پور جا کر وہیں سے کلکتے کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے یا انھوں نے بہ اختلاف اوقات فیروز پور کے دو سفر کیے تھے اور اگر دو سفر کیے تھے تو ان کے درمیان کتنا زمانی تفاوت تھا؟ جن محققین و ماہرینِ غالبیات نے اس سلسلے میں تجزیہ و تحقیق اور غور و فکر کے بعد مختلف قرائن و دلائل کی روشنی میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، ان میں سے شیخ محمد اکرام، جناب مالک رام، سید اکبر علی ترمذی، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر ابو محمد سحرؔ اور جناب کالی داس گپتا رضا کے بیانات اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ شیخ محمد اکرام ''خاتمۂ گل رعنا'' اور مکتوب بہ نام رائے چھج مل (مشمولہ پنج آہنگ) کے حوالے سے اس سفر کے محرکات، اس کے زمانۂ آغاز اور اس سے متصل واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۸۲۶ء کے قریب (غالبؔ اور نواب احمد بخش خاں کے درمیان) اختلافات رونما ہوئے۔ مرزا کے خسر مرزا الٰہی بخش معروفؔ جو نواب کے بھائی تھے، اس سال وفات پا گئے....(یہ وہ زمانہ تھا)....کہ غالبؔ کی حساس طبیعت کے لیے ذریعۂ معاش کی تنگی، بھائی کی بیماری، قرض خواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابل برداشت (ہوچکی) تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ نواب کی خدمت میں اپنا دکھ درد بیان کرو، بہت ممکن ہے کہ وہ امداد کرے، چنانچہ مرزا دہلی سے فیروز پور جھرکہ گئے۔ نواب ان دنوں الور تھا اور اپنی پریشانیوں میں گرفتار تھا، اس لیے مرزا کو فیروز پور جھرکہ رکنا پڑا.... جب خدا خدا کر کے نواب الور کے قضیوں سے فارغ ہوا اور فیروز پور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے مشورے سے امیدوں کے جو قلعے بنائے ہوئے تھے، ان کی بنیاد ریت پر ہے اور نواب سے کسی طرح کی توقع رکھنا عبث ہے....مرزا کو دہلی ناکام واپس آنا پڑا۔

مرزا کو جب نواب صاحب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی تو انھوں نے.... کلکتے میں جہاں اس وقت حکومتِ ہند کے دفتر تھے، اپیل کرنے کا ارادہ کیا....وہ تیس اکتیس برس کے ہوں گے، جب اس دور دراز سفر کے لیے گھر سے روانہ ہوئے''۔[۳]

شیخ صاحب کی طرح مالک رام صاحب نے بھی غالب کے اس سفر کو ۱۸۲۶ء میں معروفؔ کی وفات کے بعد کے واقعات میں شمار کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ان کے مطابق غالبؔ نے سفر کلکتہ کے آغاز میں فیروز پور کی بجائے لوہارو پہنچ کر نواب احمد بخش خاں سے صلح صفائی کی کوشش کی تھی اور اس میں ناکامی کے بعد وہ وہیں سے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔[۴] ''خاتمۂ گل رعنا'' میں نواب صاحب سے اس ملاقات کے بعد دہلی واپس آنے اور ایک طویل وقفے کے بعد وہاں سے دوبارہ سفر پر روانہ ہونے کا جو ذکر ہے، وہ درست نہیں۔ لیکن ۱۹۶۹ء کے ایک مضمون میں

عرضداشت موسومہ گورنر جنرل پر مبنی اپنی اس رائے سے رجوع کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ:

> ''وہ جب سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضلِ حق خیر آبادی سے وداعی ملاقات نہیں کر سکے تھے، اس لیے ان سے ملنے کو (فیروز پور سے) دہلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ کلیات (خاتمۂ گل رعنا) کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے.... درخواست میں انھوں نے اختصار سے کام لیا اور اس کا ذکر مناسب نہیں خیال کیا[۵]۔''

معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر محمود الٰہی کے اس اعتراض کے بعد کہ مولانا فضل حق سے ملاقات کی غرض سے غالب کا فیروز پور سے دہلی آنا ان کی کسی تحریر سے ثابت نہیں ہوتا[۶] مالک رام صاحب ایک بار پھر اپنے سابقہ موقف کی طرف پلٹ گئے۔ چنانچہ ''ذکر غالب'' کے ''پوری نظرِ ثانی اور اضافے کے ساتھ'' فروری ۱۹۷۶ء میں شائع شدہ ایڈیشن اور ''توقیتِ غالب'' مطبوعہ جنوری ۱۹۷۷ء میں فیروز پور سے دہلی واپس آنے کا مطلق کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ ''توقیتِ غالب'' میں سفر کلکتہ پر روانگی اور مقدمہ پنشن کی تیاری کو دسمبر ۱۸۲۶ء کا واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے فیروز پور جانے یا اس کے بعد فیروز پور سے دہلی واپس آنے کا کہیں کوئی ذکر نہیں[۷]۔

پروفیسر محمود الٰہی کا مضمون ''غالب کا سفر کلکتہ۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ'' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے بہ طور خاص مالک رام صاحب کے اس موقف کی تردید کی ہے کہ غالب نے صرف ایک بار فیروز پور کا سفر کیا تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق غالب کے سفر فیروز پور کی تعداد ایک سے زیادہ ہے اور اس بات کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ ۱۸۲۵ء میں جب وہ بھرت پور کے لیے نکلے ہیں تو اس سے قبل کم از کم ایک بار فیروز پور کا سفر کر چکے تھے۔ گویا ''خاتمۂ گلِ رعنا'' میں جس سفر سے دہلی واپس آجانے کا ذکر ہے، وہ دہلی سے بھرت پور اور فیروز پور ہوتے ہوئے کلکتے جانے والے سفر سے مختلف تھا اور اس سے پہلے پیش آچکا تھا۔

پروفیسر ابو محمد سحر کا مضمون ''خاتمۂ گلِ رعنا اور غالب کا سفرِ کلکتہ'' محمود الٰہی صاحب کے اس مضمون کا جواب ہے۔ وہ اس معاملے میں مالک رام صاحب کے ہم خیال ہیں یعنی ان کے

نزدیک بھی غالب کی تحریروں سے ان کا ایک بار سے زیادہ فیروز پور جانا ثابت نہیں ہوتا۔ ان کا استدلال حسب ذیل ہے:

> ''خاتمۂ گل رعنا میں کلکتے کے سفر سے قبل فیروز پور کے کسی اور سفر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ باندے کے مولوی فضلِ حق کے نام کے ایک خط کو نقل کرنے سے پہلے جو صراحت کی ہے، اس سے ''خاتمۂ گلِ رعنا'' کی طرح صرف اتنا (ہی) نہیں معلوم ہوتا کہ یہ خط انھوں نے فیروز پور سے لکھا تھا، بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فیروز پور کے جس سفر سے یہ خط متعلق ہے، وہ انھوں نے 'درمبادیٔ بسیچ سفر مشرق'' یعنی سفر مشرق کے ارادے کے اوائل میں کیا تھا۔ چنانچہ خاتمۂ گل رعنا میں فیروز پور کے جس سفر کا ذکر ہے، اس کو سفرِ کلکتہ کے سلسلے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں کہ کلکتہ جانے سے پہلے فیروز پور کا یہ آخری سفر تھا جو غالب نے کیا تھا[8]''

فیروز پور سے دہلی کی واپسی کے سلسلے میں مختلف تحریروں میں جن اسباب و محرکات کا ذکر آیا ہے، ان کا تجزیہ کرتے ہوئے سحر صاحب نے ایک بار پھر اپنے اس خیال کا اعادہ فرمایا ہے کہ:

> ''فیروز پور سے دہلی کی وہ واپسی جس کا خاتمۂ گل رعنا میں ذکر ہے، بلاشبہ کسی ایسی ہنگامی واپسی سے مختلف ہے جس کا درخواست سے گمان ہوتا ہے چنانچہ کسی وقتی پریشانی میں غالب فیروز پور سے دہلی واپس آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، وہ بالآخر فیروز پور سے اس طرح دہلی واپس آئے کہ کلکتے جانے سے قبل پھر فیروز پور نہیں گئے، اور اس لحاظ سے خاتمۂ گل رعنا کا اظہار حقیقت پر مبنی ہے''[9]۔

جناب اکبر علی ترمذی نے اس معاملے میں کسی بحث و استدلال سے سروکار نہ رکھتے ہوئے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ جب پنشن کے معاملے میں نواب احمد بخش خاں کی ناانصافیاں غالب کی حد برداشت سے باہر ہو گئیں تو وہ بھیس بدل کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر دو تین

ملازمین کے ساتھ دہلی سے نکلے اور اپنی شکایات براہ راست نواب صاحب کے سامنے پیش کرنے کے لیے فیروز پور پہنچے اور بھرت پور کے سقوط (۱۶ر جنوری ۱۸۲۶) تک وہیں ٹھہرے رہے۔ کافی دنوں کے انتظار کے باوجود جب انھیں نواب صاحب کی طرف سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا اور قرض خواہوں کے خوف سے دہلی واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی تو وہ (کلکتے جانے کے ارادے سے) وہیں سے کان پور کی جانب روانہ ہو گئے[۱۰]۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ترمذی صاحب کے نزدیک بھی غالبؔ صرف ایک بار فیروز پور گئے تھے۔ توقیت میں انھوں نے اس سفر کو ۱۸۲۵ء کے وسط کا واقعہ قرار دیا ہے[۱۱]۔

راقم السطور نے بھی اپنے مضمون ''غالبؔ کا سفرِ کلکتہ'' میں اس مسئلے سے بحث کی ہے اور مختلف شواہد کی روشنی میں پروفیسر محمود الٰہی کی طرح یہ موقف اختیار کیا ہے کہ غالبؔ سفرِ کلکتہ کے لیے روانگی سے قبل ایک بار فیروز پور کا سفر کر چکے تھے لیکن مولانا فضل حق کے نام کے خط کے متعلق ''خاتمۂ گل رعنا'' کی صراحت کے مقابلے میں مکتوب موسومہ مولوی محمد علی خاں کے اندراج کو ''زیادہ قرینِ صحت'' مانتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ خط سفرِ کلکتہ کے آغاز سے عین پہلے یعنی دوسرے سفرِ فیروز پور کے دوران لکھا گیا تھا[۱۲]۔

جناب کالی داس گپتا رضاؔ نے اگرچہ اپنے کسی مضمون میں اس سفر کو موضوعِ بحث نہیں بنایا ہے تاہم اپنی دو تحریروں ''سفرِ کلکتہ کی توقیت'' اور ''توقیتِ غالب'' میں علیحدہ علیحدہ تاریخوں کے تحت فیروز پور کے دو سفروں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے سفر کا زمانہ انھوں نے تقریباً جون ۱۸۲۵ء اور دوسرے سفر کے آغاز کی تاریخ ۲۸ر نومبر ۱۸۲۵ء متعین کی ہے[۱۳]۔

غالبؔ کے سفروں سے متعلق یہ تمام تفصیل جس میں ہمارے اصل موضوعِ گفتگو یعنی مکتوب بہ نام مولانا فضل حق کا ذکر بہت کم آیا ہے، اس لحاظ سے ناگزیر تھی کہ جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ غالبؔ صرف ایک بار یعنی سفرِ کلکتہ کے آغاز میں فیروز پور گئے تھے یا اس سے پہلے بھی کم از کم ایک بار وہاں جا چکے تھے، اس بحث کے لیے کوئی جواز پیدا نہ ہوگا کہ یہ خط کس زمانے میں لکھا گیا ہے، کیوں کہ جو حضرات صرف ایک سفر کے قائل ہیں، ان کے حساب سے اس خط کو لازماً سقوطِ بھرت پور ۱۸ر دسمبر ۱۸۲۵ء کے بعد کے قریبی زمانے کی تحریر ہونا چاہیے۔ غالب انھی ایام میں بھرت پور سے فیروز پور پہنچے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے، راقم السطور نے اپنے مضمون ''غالبؔ کا سفرِ کلکتہ'' میں ان کے دو بار سفر فیروز پور کا حوالہ دینے کے بعد ''مبادیٔ بسیج سفرِ مشرق'' کی رعایت سے اس خط کو دوسرے سفر سے متعلق قرار دیا ہے۔ اس دعوے کی پہلی شق پروفیسر محمود الٰہی کی رائے کے عین مطابق ہے جب کہ دوسری شق پروفیسر ابو محمد سحرؔ کے موقف کی تائید کرتی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب یہ مضمون لکھا گیا تھا، اتفاق سے ان دونوں فاضل محققین کے مضامین پیش نظر نہ تھے۔ حال ہی میں ایک دوسرے کام کے سلسلے میں سحرؔ صاحب کے مجموعۂ مضامین ''غالبیات اور ہم'' کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا تو ان کے اس مضمون کے محتویات کا علم ہوا اور اس کے حوالے سے بعد میں پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے مضمون تک رسائی حاصل ہوئی۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ پروفیسر محمود الٰہی نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا انتہائی اختصار کے باوجود جس خوبی کے ساتھ احاطہ کیا ہے اور ہر پہلو پر جتنی پرمغز اور نتیجہ خیز گفتگو کی ہے، اس کے اعتبار سے ان کی یہ تحریر اس سلسلے کی تمام تحریروں میں بالکل منفرد اور ممتاز ہے لیکن ایک نقص اس مضمون میں بھی موجود ہے کہ واقعات کی ترتیب منطقی طور پر پوری طرح درست ہونے کے باوجود فاضل محقق کے بیشتر بیانات تاریخ اور سنہ کے حوالوں سے عاری ہیں۔ اس کا سبب بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن تاریخی مآخذ کی مدد سے یہ سقم دور کیا جا سکتا تھا، وہ ان کے علم یا دسترس میں نہ تھے۔ فی الوقت اسی سلسلے میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

عرضداشت موسومہ گورنر جنرل کے مطابق خواجہ حاجی کی وفات کے بعد مرزا غالبؔ نواب احمد بخش خاں سے یہ درخواست کرنے کی غرض سے فیروز پور گئے تھے کہ اب انھیں اپنے وعدے کے مطابق خواجہ حاجی کو ملنے والی پنشن کی رقم ان کے اور ان کے بھائی کے نام منتقل کر دینا چاہیے۔ اس زمانے میں نواب صاحب جن ذہنی و جسمانی کیفیات سے دوچار تھے، غالب کے الفاظ میں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

> ''اس سے تھوڑے دن پہلے نواب صاحب کو بہت زخم آئے تھے اور ان کے باعث وہ بہت بیمار تھے۔ انھیں ایام میں وہ بسترِ علالت سے اٹھے تھے۔ مزید برآں ان کی الور کی مختاری بھی جاتی رہی تھی جس سے وہ بہت افسردہ اور غمگین تھے۔ وہ میرے سامنے رونے بلکہ

ہچکیاں لینے لگے (اور) فرمایا: تم میرے بچے اور نورِ نظر ہو۔ دیکھو مجھے کیسے زخم آئے ہیں اور کیسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرا حق مارا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر افسوس ناک امر یہ ہے کہ جرنیل اختر لونی کی اور میری دوستی ختم ہوگئی[14]۔

یہ سلسلۂ واقعات مکتوب موسومہ مولانا فضلِ حق کے اس بیان سے پوری طرح مربوط ہے کہ:

''عِم کامگار در وہم و ہراسِ مکر و حسدِ اعداو در دِ عدم محاصلِ سرکار الور و ملال در آمد گرہا سرگرم و سوگوار و گم کردہ آرام۔ اور امہر کو کہ کس را دل دہد و ہم در اصلاحِ حالِ کس گمارد''[15]۔

ان دونوں بیانات کے یکجائی مطالعے سے تین اہم کلیدی نکتے سامنے آتے ہیں:

(۱) غالب کے فیروز پور پہنچنے سے پہلے نواب احمد بخش خاں پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔

(۲) وہ دشمن جن کی سازش کے نتیجے میں نواب صاحب پر حملہ ہوا تھا، اب بھی ان کے خلاف سرگرم تھے۔

(۳) جنرل اختر لونی سے ان کے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔

ان واقعات کا پس منظر یہ ہے کہ نواب احمد بخش خاں اور راؤ راجا بختاور سنگھ، والی الور کے درمیان بڑے دوستانہ و مخلصانہ روابط تھے۔ انگریزی حکومت میں نواب صاحب کے غیر معمولی اثر و رسوخ کی بنا پر مہاراجا نے مسند نشینی کے کچھ دنوں بعد ہی انھیں ریاست کا وکیل مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے انگریز حکام سے ریاست کے تعلقات کی استواری میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ علاوہ بریں ان دونوں کے درمیان قربت و رفاقت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مہاراجا کی داشتہ موسی اور نواب صاحب کی مدخولہ مدّی دونوں سگی بہنیں تھیں۔ یہ دونوں ہی صاحبِ اولاد تھیں اور مہاراجا اور نواب صاحب دونوں خاندانی روایات کے برخلاف ان کے بیٹوں کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ اس خواہش کی تکمیل میں نواب صاحب مہاراجا سے زیادہ سرگرم اور پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۵ر صفر ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۷ر جنوری ۱۸۱۵ء کو جب راجا بختاور سنگھ کا انتقال ہو گیا اور خاندان کے بااثر لوگوں نے موسی کے بیٹے بلونت سنگھ کی بجائے ان کے بھتیجے بنے سنگھ کو جانشین بنانا چاہا تو

نواب صاحب کی حکمتِ عملی کے نتیجے میں اس نزاع کے فیصلے کی صورت یہ قرار پائی کہ بے سنگھ اور بلونت سنگھ دونوں ایک ساتھ مسند نشین ہوں اور حکومت میں مساوی طور پر شریک رہیں۔ اس زمانے میں یہ دونوں لڑکے نابالغ تھے۔ مسند نشینی کی اس رسم کے کچھ دنوں بعد نواب صاحب نے ریاست کے دو پرگنوں تجارہ اور ٹپوکڑا کا ٹھیکا حاصل کرلیا۔ ۱۲/ربیع الاول ۱۲۳۲ھ مطابق ۳۰ جنوری ۱۸۱۷ء کو وہاں ان کا باقاعدہ عمل دخل قائم ہوگیا۔ بے سنگھ کے حامی اس صورت حال سے نہ صرف یہ کہ ناخوش تھے بلکہ بلونت سنگھ اور ان کے سرپرستوں کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ تا آں کہ جب بلونت سنگھ اور بے سنگھ دونوں سن بلوغ کو پہنچے تو ان مخالفین نے چھے ہزار روپے نقد اور ایک گانو بہ طور انعام دینے کا وعدہ کر کے ایک میو کو اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ نواب صاحب کا کام تمام کردے۔ مسلسل آٹھ ماہ تک گھات میں رہنے کے بعد اس نے ۲۰/شعبان ۱۲۳۸ھ مطابق ۲/مئی ۱۸۲۳ء کی شب میں جب کہ نواب صاحب دہلی میں اپنی قیام گاہ میں آسودۂ خواب تھے، ان پر حملہ کردیا لیکن پہلے دو وار کارگر ثابت نہ ہوئے اور تیسرے وار میں تلوار ٹوٹ گئی، اس لیے قاتل اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ جب اس سازش کا راز کھلا تو بلونت سنگھ نے قاتل اور اس قتل کا منصوبہ بنانے والوں کو گرفتار کر کے قید کردیا لیکن اس گروہ کا سرغنہ راموں خواص کسی طرح بچ نکلا اور چھپتا چھپاتا دہلی پہنچ گیا۔ وہاں اس نے پہلے نواب صاحب سے مل کر معافی تلافی کی کوشش کی اور جب اس میں کامیاب نہ ہوا تو جنرل اخترلونی کے سررشتہ دار منشی کرم احمد کو کئی لاکھ روپے بہ طورِ رشوت دینے کا وعدہ کر کے اپنا ہمنوا اور معاون بنالیا۔ اس طرح جنرل صاحب جو نواب صاحب کے دوست تھے اور ہر معاملے میں ان کے معین و مددگار رہتے تھے، ان کے مخالف ہوگئے۔ جنرل صاحب کی حمایت و سرپرستی حاصل ہوجانے کے بعد راموں کے اشارے پر بے سنگھ کے حامی راجپوتوں نے ۹/ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷/اگست ۱۸۲۳ء کو رات کے وقت بلونت سنگھ کے محل پر حملہ کردیا۔ اس یورش میں ان کے دس محافظوں نے اپنی جان گنوائی اور باقی ہتھیار ڈال کر ان کی حمایت سے دستکش ہوگئے۔ بلونت سنگھ کو گزند پہنچانا اس سازش کے مقاصد میں شامل نہ تھا، اس لیے وہ محفوظ رہے اور ایک حویلی میں نظر بند کردیے گئے۔ اس کے بعد بے سنگھ بلا شرکتِ غیرے پوری ریاست الور پر قابض و متصرف ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی نواب صاحب کی مختاری بھی جاتی رہی اور تجارہ اور ٹپوکڑا کی مستاجری کا بھی خاتمہ ہوگیا اور وہ سارے

اختیارات سے محروم ہو کر فیروز پور چلے آئے۔ ۲۰ محرم ۱۲۳۹ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۸۲۳ء کو راموں خواص کے نمائندے بھوانی سنگھ نے باقاعدہ طور پر ان دونوں پرگنوں کی عاملی کے اختیارات سنبھال لیے[16]۔

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ نواب احمد بخش خاں ۲ مئی ۱۸۲۳ء کو بہ مقام دہلی ایک قاتلانہ حملہ میں مجروح ہوئے۔ یہی حادثہ جنرل اختر لونی سے ان کے تعلقات کی کشیدگی کا سبب بنا۔ کچھ دنوں میں زخموں کے مندمل ہو جانے کے بعد وہ دہلی سے دوبارہ الور یا تجارہ چلے گئے۔ ۱۷ اگست ۱۸۲۳ء کو بلونت سنگھ کی نظر بندی کے ساتھ ریاست سے ان کے تمام سیاسی و اقتصادی روابط منقطع ہو گئے اور ۲۶ ستمبر ۱۸۲۳ء سے کچھ پہلے وہ وہاں سے ترکِ تعلق کر کے فیروز پور چلے آئے۔ ان حالات کی روشنی میں اب یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ غالب ۱۸۲۳ء کی آخری تماہی میں کسی وقت فیروز پور پہنچے ہوں گے اور اسی زمانے میں انھوں نے مولوی فضل حق کے نام وہ خط لکھا ہوگا جس کا زمانۂ تحریر اب تک غلط قیاسات کی بنیاد پر متعین کیا جاتا رہا ہے۔ اس دریافت کے بعد ''خاتمۂ گلِ رعنا'' کے اس بیان کی صداقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس سفر فیروز پور پر ''روزگارے دراز'' گزر جانے کے بعد ہی غالب اپنی زندگی کے اس اہم ترین اور طویل ترین سفر پر روانہ ہوئے تھے، جس کی پہلی منزل بھرت پور اور آخری منزل کلکتہ تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق ان دونوں سفروں کے درمیان کم از کم دو سال کا فرق تھا۔ اس کے ساتھ ہی مولوی محمد علی خاں کے نام کے خط میں ان کا یہ بیان بھی کہ زیر بحث خط انھوں نے ''درمبادیِ بسیچ سفر مشرق'' لکھا تھا، خلافِ واقعہ نہیں۔ عرضداشت موسومہ گورنر جنرل کے مطابق فیروز پور پہنچنے کے بعد غالب اور نواب صاحب کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، اس میں یہ مکالمہ بھی موجود ہے کہ:

> 'آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جائز وارثوں کو ان کا حق دینا چاہیے یا پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں خود جا کر اپنا مطالبہ حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کروں'[17]۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دہلی سے یہ ارادہ کر کے نکلے تھے کہ اگر فیروز پور میں ان کی بات نہ سنی گئی تو کلکتے جا کر اپنا مطالبہ براہِ راست حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کریں گے۔

شرحِ صدر کے لیے یہاں الور کے واقعات کے سلسلے میں تھوڑی سی مزید تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ۱۷ راگست ۱۸۲۳ء کے فساد اور بلونت سنگھ کی نظر بندی کے بعد نواب احمد بخش خاں اور جنرل اختر لونی دونوں نے اپنے اپنے طور پر تمام واقعات کی رپورٹ صدر کو بھیج دی تھی۔ اس پر جنرل صاحب کے نام یہ حکم صادر ہوا کہ "بہ استرضائے نواب احمد بخش خاں کاربندی رہے اور (فریقین سے) راضی نامہ لیا جاوے" [18]۔ اس فیصلے کے بعد جنرل اختر لونی کے لیے راموں خواص کی حمایت سے کنارہ کشی اور نواب صاحب کے ساتھ اتحاد و تعاون کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا چنانچہ وہ راموں پر یہ الزام رکھ کر کہ اس نے ان سے صلاح و مشورہ کے بغیر فسادیوں کو رہا کر کے عہد شکنی کی ہے، اس کی سرپرستی سے دست بردار ہو گئے [19]۔ اندازہ یہ ہے کہ نواب صاحب اور جنرل اختر لونی کی رپورٹیں کلکتے پہنچنے اور وہاں سے ان پر احکام صادر ہونے میں دو تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا ہوگا۔ ان رپورٹوں کے جواب میں وہاں سے جو حکم جاری ہوا تھا، وہ نواب صاحب کے لیے فتح و کامرانی کی نوید اور جنرل اختر لونی سے تعلقات کی بہتری کی بشارت لے کر آیا تھا۔ یہ صورتِ حال اس کیفیت سے بڑی حد تک مختلف تھی جس کا مولانا فضلِ حق کے نام کے خط اور عرضداشت موسومہ گورنر جنرل کے پیش کردہ اقتباسات میں تذکرہ ہے۔ اس سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ مولانا فضلِ حق کے نام یہ خط ستمبر ۱۸۲۳ء میں نواب صاحب کے الور سے قطعِ تعلق اور فیروز پور میں ورود کے کچھ دنوں بعد ہی لکھا گیا ہوگا۔

غالب کے پہلے سفر فیروز پور سے متعلق تاریخی شواہد پر مبنی اس تازہ معلومات کی روشنی میں ماہرینِ غالبیات کے کم از کم دو بیانوں کی تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلے بیان کے مطابق غالب اور نواب احمد بخش خاں کے درمیان پنشن کے معاملے میں نزاع کی باقاعدہ ابتدا نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی وفات (۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۶ء) اور نواب شمس الدین احمد خاں کے حق میں نواب احمد بخش خاں کی حکومت سے دست برداری (۱۳ را کتوبر ۱۸۲۶ء) کے بعد ہوئی تھی [20]۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ مرزا غالب ۱۸۲۳ء کی آخری تماہی میں فیروز پور پہنچ کر اپنا مقدمہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر چکے تھے، یہ اظہار بے معنی ہو جاتا ہے۔

دوسرا بیان خواجہ حاجی کے سالِ وفات سے متعلق ہے۔ تمام محققینِ غالب جنھوں نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے، اس پر متفق ہیں کہ وہ ۱۸۲۵ء میں فوت ہوئے۔ اس کی بنیاد عرضداشت

موسومہ گورنر جنرل کا یہ اندراج ہے کہ "نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین میں ایک شخص خواجہ حاجی نام تھا، تین برس ہوئے اس کا جذام کے مرض سے انتقال ہوگیا" [۲۱]۔ چوں کہ یہ عرضداشت ۲۸ راپریل ۱۸۲۸ء کو لکھی گئی تھی، اس لیے بہ ظاہر یہ قیاس کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا کہ خواجہ حاجی اس سے تین برس پہلے ۱۸۲۵ء میں فوت ہوئے ہوں گے لیکن اسی عرضداشت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد ان کے حصے کی رقم حسب وعدہ نصر اللہ بیگ خاں کے جائز ورثاء کے نام منتقل نہ کیے جانے کی شکایت لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، اس لیے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں رہ جاتا۔ چوں کہ غالب تفاوتِ زمانی کے بیان میں بہ قدرِ ضرورت احتیاط اور ذمہ داری سے کام لینے کے عادی نہیں۔ اس لیے ان کے ان دونوں بیانات میں سے یہ بیان کہ وہ خواجہ حاجی کی وفات کے بعد دہلی سے فیروز پور گئے تھے، قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خواجہ حاجی ۱۸۲۳ء کے اوائل میں یا اس سے کچھ پہلے وفات پا چکے تھے۔

حواشی:

۱۔ گلِ رعنا، مرتبہ مالک رام، شائع کردہ علمی مجلس دلی، مئی ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱

۲۔ نامہ ہائے فارسیِ غالب، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، شائع کردہ غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰

۳۔ غالب نامہ، از شیخ محمد اکرام، مطبوعہ بمبئی، ص ۶۶ تا ۶۸

۴۔ ذکر غالب، از مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۵۵

۵۔ ذکر غالب، کچھ نئے حالات، مضمون مشمولہ ماہنامہ "افکار" کراچی، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، حاشیہ ص ۵۱، بہ حوالہ "غالبیات اور ہم"، از ابو محمد سحر، ص ۶۵

۶۔ غالب کا سفر کلکتہ۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ، سہ ماہی "اردو" کراچی، شمارہ خصوصی بہ یاد غالب، حصہ دوم، ۱۹۶۹ء، ص ۸۴۔

۷۔ فسانۂ غالب، از مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴

۸۔ غالبیات اور ہم، از پروفیسر ابو محمد سحر، شائع کردہ تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۶۵، ۶۶

۹۔ایضاً،ص ۶۷

۱۰۔نامہ ہائے فارسیِ غالب، مقدمۂ انگریزی، ص ۱۹، ۲۰

۱۱۔ایضاً، مقدمہ، ص ۵۵

۱۲۔غالب: احوال و آثار، از حنیف نقوی، شائع کردہ نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۴

۱۳۔غالب، درونِ خانہ، از کالی داس گپتا رضا، شائع کردہ ساکار پبلشرز، بمبئی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۶، ۸۷، ۲۷۸

۱۴۔فسانۂ غالب، ص ۱۱۰

۱۵۔نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۱۱

۱۶۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ارژنگِ تجارہ، از محمد مخدوم تھانوی، مطبوعہ ۱۲۹۰ھ، ص ۷۰ تا ۷۵

۱۷۔فسانۂ غالب، ص ۱۱۰

۱۸۔ارژنگ تجارہ، ص ۷۵

۱۹۔ایضاً، ص ۷۶

۲۰۔غالب نامہ، ص ۶۵، ۶۶ و ذکر غالب، ص ۵۱، ۵۲

۲۱۔فسانۂ غالب، ص ۱۱۳

غالبؔ کے تین فارسی خطوط

ہفت روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی، شمارہ ۲۲ر تا ۲۸ر فروری ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی کا ایک مضمون بہ عنوان ''مرزا غالبؔ کا ایک فارسی خط منیرؔ شکوہ آبادی کے نام'' شائع ہوا ہے، جس میں نواب رحمت اللہ خاں شروانی کے کتب خانے (واقع علی گڑھ) کے ایک قلمی نسخے موسوم بہ ''رقعاتِ منیر'' کے حوالے سے غالبؔ کا ایک فارسی خط دریافت کر کے شائع کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے غالباً ''رقعاتِ منیر'' کے حوالے کو کافی سمجھ کر اس خط کے منیرؔ شکوہ آبادی سے انتساب کی تائید میں کوئی اور دلیل پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ''رقعاتِ منیر'' سے بالعموم ابوالبرکات منیرؔ لاہوری کے مجموعۂ رقعات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے جس کے قلمی نسخے لائبریریوں میں عام طور پر دستیاب ہیں اور ''انشاے منیر'' کے نام سے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن منیرؔ لاہوری سے غالبؔ کے کسی خط کا انتساب اس لیے ممکن نہیں کہ وہ جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد کا مصنف ہے اور غالب کی ولادت سے کچھ اوپر ڈیڑھ سو سال پہلے ۷ر رجب ۱۰۵۴ھ (۳۰ر اگست ۱۶۴۴ء) کو اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس بنا پر مضمون نگار نے یہ تصور کر لیا کہ اس مجموعے کے مرتب منیرؔ شکوہ آبادی ہی ہو سکتے ہیں جو غالبؔ کے ہم عصر تھے لیکن اس اہم نکتے کو انھوں نے یکسر نظر انداز کر دیا کہ ''رقعاتِ منیر'' منیرؔ کے لکھے ہوئے رقعات کا مجموعہ تو

ہو سکتا ہے، ان کے نام دوسروں کے بھیجے ہوئے خطوط کا مجموعہ نہیں ہو سکتا۔

''رقعاتِ منیر'' سے موسوم متذکرۂ بالا نسخہ جس سے غالبؔ کا یہ خط ماخوذ ہے، نواب رحمت اللہ خاں کے کتب خانے کے رجسٹر میں ۱۵۸۹ نمبر پر درج ہے۔ اس کے اوراق کی کل تعداد سترہ ہے۔ مسطر بالعموم بارہ سطری ہے لیکن کسی کسی صفحے پر ایک دو سطریں کم بھی ہیں۔ اس میں خطوط کی کل تعداد پندرہ ہے اور یہ مختلف مکتوب نگاروں کے نتائجِ قلم ہیں۔ پہلے صفحے کی پہلی سطر کے سامنے بائیں طرف حاشیے پر ''رقعات منیرؔ'' لکھا ہوا ہے جسے غلطی سے اس مجموعے کا نام سمجھ لیا گیا ہے۔ قرائنِ ظاہری کے مطابق یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس مجموعے کے شروع کے دو چار خط منیرؔ لاہوری یا ان کے کسی ہم تخلص مصنف کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعد کے اوراق میں صرف تین خطوں کے سرِ عنوان مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے نام اور ایک کے حاشیے پر صرف مکتوب نگار کا نام درج ہے۔ یہ آخر الذکر خط مرزا غالب کا ہے جو صفحات نمبر ۲۳ تا ۲۵ پر منقول ہے اور اس جس کے بائیں طرف حاشیے پر بالکل اسی طرح جس طرح صفحہ نمبر ا کی پہلی سطر کے بالمقابل ''رقعات منیر'' لکھا ہوا ہے، ''رقعۂ اسد اللہ خاں غالبؔ'' مرقوم ہے۔ جن تین خطوں کے عنوانات میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے نام درج ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(ا) رقعۂ مولوی جمیل الدین بہ نام قرۃ العین ...محمد امجد سلمہ اللہ الاحد (ص ص ۲۱ تا ۲۳) ہفتم ماہ ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (۱۰ر دسمبر ۱۸۴۲ء، (ص ص ۲۵ تا ۲۹)

(۳) خط پادری فنڈر صاحب از مقام اکبرآباد بہ نام مجتہد العصر والزماں مولوی سید محمد صاحب مرقومہ ۱۳ر جنوری ۱۸۴۳ء (ص ص ۲۹ تا ۳۲)

آخر الذکر خط کے عنوان میں اس مجموعے کے مرتب نے مولوی سید محمد صاحب کو ''محسن ومکرمِ بندہ، مقتدائے فضلائے اکمل، پیشوائے علمائے اجل'' لکھا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہ اعتبارِ عقیدہ اثنا عشری اور بہ گمانِ غالب لکھنؤ کا متوطن تھا۔

مرزا غالبؔ کا خط جو یہاں زیرِ بحث ہے، درج ذیل ہے:

''بہ نام نامور سازِ گم ناماں! مشاہدۂ صفوت نامہ دل را صفا و دیدہ را

جلاداد۔ کاغذِ مسودہ بعدِ حک واصلاح ہم درنوردِ ایں ورق می رسد بہ آئینے کہ گردِ ملال برخاطرِ عاطر ننشیند، گفتہ می شود کہ فقیر را ہوائے ریختہ در سرو ہنجارِ ایں گفتار در نظر نماندہ است۔ ہر کہ بہ من روی آرد، من اورا بہ فلاں متخلص بہ عارف کہ ہم فرزندِ من است و ہم شاگرد، می سپرم۔ چنانچہ بہ الطاف نشاں فلاں کہ در زمرۂ یاراں از وے عزیز ترے گماں ندارم، نیز ایں ماجرا رفتہ است و جہانِ مہر ووفا، لالہ فلاں سلمہ، ہم بہ عارفِ نوائیں نواحوالت کردہ ام۔ بیچارہ چہ کند کہ از دیر باز بیمارو بہ گونا گوں رنجوری ہا گرفتار است، ورنہ طبعِ دقیقہ سنج واندیشۂ دوررس دارد و می تواند، از عہدۂ ایں کار برآید و درحک و اصلاح نقش ہائے شگرف ریخت۔ بارے دعا کنند کہ بندِ اندوہ از دلم برخیزد و عارفِ ستودہ خوے تندرست وتوانا گردد۔ رہ پیمائی خامہ در وادیِ ایں نگارش از بہر آنست کہ فرارسند و دریابند کہ ایں بار فرمانِ شما بجا آوردم و خود را گرد آوردہ بہ ہنجارِ سگالش سراپائے گفتارِ شما گزشتم تاندانند کہ فلاں بہ ماپر داخت وکلامِ مارا روشناسِ نظر نساخت۔ زیں پس ہر چہ از شما خواہد رسید، مانندِ مسوداتِ دوستانِ دیگر نزدِ من خواہد ماند۔ چوں عارف را از رنجوری رہائی رو خواہد داد، نوردِ آں قرطاس از ہم خواہد کشود و مشاطگیِ شاہدِ گفتار خواہد نمود۔ بیدلؔ کہ روانش فردوس نشیمن باد، خوش می گوید:

جہدِ ما درخورِ توانائی است　　　ضعف یکسر فراغ می خواہد"

اس خط میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے یہ اندازہ کیا جاسکے کہ اس کے مکتوب الیہ منیر شکوہ آبادی ہو سکتے ہیں۔ البتہ پادری فنڈر صاحب کے خط کے عنوان کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ مکتوب الیہ اس مجموعۂ خطوط کے مرتب کا ہم وطن یعنی لکھنؤ کا باشندہ یا اس کا کوئی بیرونی دوست ہوسکتا ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ یہ خط غالبؔ ہی کا لکھا ہوا ہے تاہم اس میں لفظ "فلاں" کا یکے بعدِ دیگر چار بار استعمال حیرت انگیز ہے۔ غالبؔ

کے خطوط میں اس طرح غیر ضروری طور پر اخفاے حال یا ابہام پیدا کرنے کی کوئی اور مثال نظر نہیں آتی۔ خصوصاً پہلی بار "فلاں متخلص بہ عارف" میں اس لفظ کا استعمال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ "الطاف نشاں فلاں" کا اشارہ ممکن ہے کہ حکیم سعید الدین کامل بدایونی کی طرف ہو جو مولوی عزیز الدین عزیز وصادق بدایونی شاگردِ غالب کے بڑے بھائی تھے اور عارف سے اصلاح لیتے تھے۔ اس کا امکان ہے کہ انھوں نے غالب ہی کے مشورے پر عارف سے رجوع کیا ہو۔ "جہانِ مہر و وفا، لالہ فلاں سلمہ" کی نشاں دہی بہ ظاہر محال ہے۔

عارف کا انتقال ۱۲۶۸ھ (۵۲۔۱۸۵۱ء) میں ہوا۔ وفات سے پہلے وہ کافی دنوں تک سخت بیمار رہے تھے۔ یہ خط غالباً مرض الموت کے اسی زمانے میں لکھا گیا ہے۔ اس خط کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطوط کا یہ مجموعہ یا تو عارف کی علالت کے انھی ایام میں یا اس کے بعد کسی وقت مرتب ہوا ہوگا۔

دوسرا خط جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے "مراسلاتِ غالب و حضرت سید علی غمگین" کے قلمی نسخے سے لیا گیا ہے۔ خطوط کا یہ مجموعہ گذشتہ صدی کے ساتویں عشرے کے اواخر تک غمگین اکادمی، فقیر منزل، گوالیار میں محفوظ تھا۔ ستمبر ۱۹۷۱ء سے قبل یہ کسی طرح وہاں سے مانٹریال (کناڈا) میں اردو کے استاد محمد عبدالرحمٰن بارکر کے ذاتی کتب خانے میں پہنچ گیا اور اب ان کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اینڈ سویلزیشن، کوالالمپور، ملیشیا کی لائبریری میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس وقت اسی لائبریری سے پروفیسر معین الدین عقیل (کراچی) کی عنایت سے حاصل شدہ اس نسخے کا عکس ہمارے پیش نظر ہے۔ اس مجموعے میں غالب کے کل بارہ خطوط شامل ہیں۔ ان میں سے دس حضرت سید علی غمگین گوالیاری کے نام ہیں، جب کہ باقی دو مکتوب "خطِ مرزا نوشہ بہ دوستانِ ساکنِ لکھنؤ" کے زیرِ عنوان منقول ہیں۔ یہ عنوان اسی صورت میں پہلے اور دوسرے دونوں خطوں سے پہلے درج ہے۔ غمگین کے نام کے خطوط یا ان کے اقتباسات مختلف مضامین یا کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن باقی دو خطوں کا مختصر حوالہ بھی کسی جگہ کم از کم راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ حتیٰ کہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے بھی جو اس مجموعے سے براہِ راست استفادہ کرنے والے معدودے چند افراد میں سے ایک ہیں، انھیں غور سے پڑھنا تک ضروری نہیں سمجھا۔ (اردوے معلیٰ، غالب نمبر، جلد اول، ص ۱۴۳) ان میں سے پہلا خط بہ صورتِ

مطبوعہ ''پنج آہنگ'' میں موجود ہے۔ یہ شیخ امیر اللہ سرور کے نام ہے جو ''تلامذۂ غالب'' کے مطابق اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ دوسرا خط جواب تک طباعت سے روشناس نہیں، درج ذیل ہے:

''مجموعۂ مہر و وفا سلامت۔ بامداد دوشنبہ کہ روز دہم بود از اگست، صبا خرام بریدے از بریدانِ ڈاکِ انگریزی رسید و دل نواز نامہ بہ من سپرد، تا از عنوانش نقشِ ایں آگہی در نظر جلوہ کرد کہ لکھنؤ تماشا گاہِ شماست۔ دل بر سرگردانیِ شما بسوخت۔ بارے چوں از ہماں نامہ آشکار شد کہ بہ دامنِ صاحب دولتے آویختہ اید و بہ رفاقتِ نواب جمیل المناقب مرزا محمد مسیح خاں بہادر بہ لکھنؤ رفتہ اید، شورشِ ضمیر فرونشست و فرجامِ آشفتگی برخاست۔ می نویسید کہ دوتا نامہ فرستادیم و مارا بہ پاسخ یادنیاوردی۔ مہربانا خدمتِ ناگزاردہ شما مجراست، جرمِ ناکردۂ مانیز تواں بخشید۔ انصاف بالاے طاعت، دریں سیہ روزگاران و تیرہ دورِ زمانِ آمد آمدِ نواب گورنر جنرل بہادر کہ دریں دیار دوبار اتفاق افتادہ، بسا آسیمہ و سرگرداں بہ ہر در گرداں ماندہ ام۔ دل از کزلکِ ستم صد پارہ و ہر پارہ بہ جاے دیگر آوارہ۔ طرفہ ایں کہ ہنوز داوری قطع نگر دیدہ و تیرہ شب نا امیدی را بامداد نرسیدہ۔ کاش دانستمے کہ کشائشِ ایں کار در کردِ کدامیں ہنگام است تا پراگندہ دل تر نگشتمے و در کشاکشِ بیم و امید نماندمے۔ بارے خوشا گراں مایگیِ بختِ سازگارِ شما کہ بہ لکھنؤ رسیدید و فیضِ صحبتِ جنابِ معلّی القاب مرزا تقی ہوسؔ و خواجہ حیدر علی آتشؔ دریافتید۔ واے بر من کہ پنج ماہ در لکھنؤ متولی ٹولہ (کذا = بہ تَوَئی ٹولہ) خاک نشینی اختیار کردہ ام (و) دیدہ را بہ کفِ پاے ایں گراں مایگاں روشناس نساختم۔ فرماں دادہ اید کہ غالبؔ مستہامِ ریختۂ چند از رگِ کلک بر ورق فروریزد و بہ خدمت فرستد۔ ہمانا فراموش کردہ اید کہ ذوقِ اشعار پارسی دلم فرو گرفتہ و فکرِ ریختہ متروک گشتہ۔ مگر نمی دانید کہ عرضِ ایں متاع در لکھنؤ گل بہ گلستاں و سرمہ بہ اصفہاں فرستادن است۔ من و خدا کہ حالیا ریختہ من نمی گویم واز گفتہ ہاے پیشیں ہرانچہ بہ مذاقِ شعریِ من گوارہ آمدہ، انتخاب کردہ بقیہ دفتر را یک قلم فروشستہ ام۔ بایں ہمہ چوں خاطرِ شما عزیز است، ہشت غزل بہ خدمت می فریسم۔ باید کہ بہ خدمت رفعات درجت جناب معلّی القاب مرزا تقی ہوسؔ و خواجہ حیدر علی آتشؔ گزراندہ از طرف راقم عطیۂ اصلاح استدعا کنند وانچہ بعد از استماعِ ایں ترہات بر زبانِ گہر فشاں بگزرد، بہ من بنویسند۔ والسلام والا کرام فقط''۔

داخلی قرائن و شواہد کی رو سے اس خط کی تاریخ تحریر دوشنبہ، ۱۳؍اگست ۱۸۳۲ء ہے۔

مجموعے میں شامل اس سے پچھلا خط اس سے چند ماہ قبل لکھا گیا تھا۔ ان دونوں خطوں کے بعض لفظی و معنوی اشتراکات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مکتوب الیہ فردِ واحد ہے۔ مثلاً:

(۱) ان دونوں خطوں میں مکتوب الیہ کے خط کو "دل نواز نامہ" کہا گیا ہے۔

(۲) پہلے خط کا آغاز "حضرت سلامت" سے اور دوسرے کا "مجموعۂ مہر و وفا سلامت" سے ہوا ہے۔

(۳) غالبؔ کے قیاس کے مطابق مکتوب الیہ خط لکھنے میں تساہل کا عادی ہے مگر اپنی خفت مٹانے کی غرض سے دروغ بافی سے کام لیتا ہے اور ان سے خطوں کے جواب نہ دینے کی شکایت کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ پہلے خط میں لکھتے ہیں:

> "گلہ از نارسیدنِ پاسخ نامہ ہاے خویش می کنید واز خدا شرم ندارید..... دانستم کہ یک چند مرا فراموش کردہ بودید۔ ناگاہ..... شنیدید کہ فلانے از سخت جانی ہنوز زندہ است، مہرِ کہن بجنبید، خواستید کہ بہ نامہ یاد آورید، از فراموشیِ روزگارِ گذشتہ اندیشہ کردید۔ لاجرم دروغے چند باہم بافتید وآں را دیباچۂ دیباے نامہ ساختید....."

اس خط میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے:

> "می نویسید کہ دو تا نامہ فرستادیم و مارا بہ پاسخ یاد نیاوردی۔ مہربانا خدمتِ ناگزاردہ شمار مجرا است، جرمِ ناکردۂ ما نیز تواں بخشید۔"

(۴) پہلے خط میں گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک بہادر کے دہلی میں ورود کے انتظار کی بات کہی گئی ہے، دوسرے خط میں گورنر جنرل کی شہر میں مکرر آمد پر اپنی "آسیمہ سری و سرگردانی" کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۵) پچھلے خط کے بعض مندرجات سے مکتوب الیہ کے عارضی طور پر لکھنؤ میں مقیم ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے خط میں اپنے مربی و سرپرست نواب مرزا محمد مسیح خاں بہادر کی معیت میں ان کے لکھنؤ میں ورود اور قیام کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔

(۶) پچھلے خط میں غالبؔ لکھتے ہیں: "خواستہ اید کہ از.....تراویدہ ہاے کام و زبانِ

خود بہ شمار رمغانے فرستم۔'' اس خط میں مکتوب الیہ کی اس فرمائش کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

''فرماں دادہ اید کہ غالبؔ مستہام ریختۂ چند از رگِ کلک بر ورق فروریزد و بہ خدمت فرستد۔''

(۷) پچھلے خط میں مرزا غالبؔ نے مکتوب الیہ کو مرزا حیدر علی افصحؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ اور ''دیگر تازہ خیالانِ لکھنؤ'' کی ''روشِ پسندیدہ وطرزِ گزیدہ'' کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ اس وقت تک ان شعرا میں سے مرزا محمد تقی ہوسؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کے فیضِ صحبت سے مستفید ہو چکے تھے۔

مندرجۂ بالا شواہد کی روشنی میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس خط کے مکتوب الیہ بھی شیخ امیر اللہ سرورؔ ہی ہیں۔

غالبؔ کے اس خط کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے پہلی بار یہ اطلاع ملتی ہے کہ غالبؔ دہلی سے کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ میں بہ غرض علاج اپنے طویل قیام کے دوران چوک کے علاقے میں محلّہ توَئی ٹولہ (=تھوئی ٹولہ) میں مقیم رہے تھے۔ اس خط میں انھوں نے اپنے اس قیام کی مدت پانچ ماہ بتائی ہے۔ اس سے قبل مقدمۂ پنشن کے عرضی دعوے میں بھی انھوں نے لکھنؤ میں پانچ مہینے سے کچھ اوپر بستر پر پڑے رہنے کا ذکر کیا ہے اور اس کے کئی برس بعد ابن حسن خاں کے نام کے ایک خط میں وہاں قیام کی مجموعی مدت ''کما بیش پنج ماہ'' قرار دی ہے۔ لیکن ہماری تحقیق کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں ان کا یہ قیام تقریباً آٹھ ماہ (اواخرِ اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۸۲۶ء تا ۲۱ر جون ۱۸۲۷ء) کو محیط تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ پوری مدت تقریباً گوشہ گیری کے عالم میں گزاری۔ لکھنؤ جیسے مرکزِ شعروادب میں رہتے ہوئے آتشؔ اور ہوسؔ جیسے اساتذۂ وقت سے ملاقات نہ کرنا یا ملاقات نہ ہونا ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جو اس خط کی عدم موجودگی میں کسی طرح قابلِ اعتبار نہ ہوتا۔ اس سلسلے میں شیخ امام بخش ناسخؔ کا نام نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اس زمانے میں سیاسی حالات کی نامساعدت کی بنا پر لکھنؤ سے ترکِ سکونت کر کے الٰہ آباد میں فروکش تھے۔ بہرحال آتشؔ اور ہوسؔ کے سلسلے میں غالبؔ کے اس بیان سے ان کے جس غیر متوقع رویّے کا

اظہار ہوتا ہے، اس کی وجہ کوئی سیاسی مصلحت تھی یا محض ذاتی انا، یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔

اس سلسلے کا تیسرا خط جس کا تعارف مقصود ہے، مولانا غلام رسول مہؔر کی دریافت ہے۔ یہ بھی ابھی تک غالبؔ کے فارسی خطوط کے کسی مجموعے میں جگہ نہیں پا سکا ہے۔ اس کے مکتوب الیہ مولوی رجب علی خاں ارسطو جاہ اپنے زمانے کی ایک معروف شخصیت تھے۔ ''پنج آہنگ'' اور ''باغ دو در'' دونوں میں ان کے نام کے دو دو خط شامل ہیں۔ مولانا مہؔر نے اس خط کا عکس اپنی کتاب ''غالب'' کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۶ء میں ورق نمبر ۶۴ کے بالمقابل شائع کیا تھا۔ سوءِ اتفاق سے اس اشاعتِ عام کے باوجود یہ خط پروفیسر مسعود حسن رضوی اور قاضی عبدالودود دونوں کی نظروں سے مستور رہا ورنہ اسے ''متفرقاتِ غالب'' یا ''مآثرِ غالب'' میں شامل ہو جانا چاہیے تھا۔ مولانا مہؔر کے فراہم کردہ عکس کے مطابق اس کا مکمل متن حسب ذیل ہے:

مولانا و سیدنا و مخدومنا و مطاعنا سلمکم اللہ تعالیٰ

پیش ازیں عرض داشتے کہ بہ پاسخِ توقیعِ عطوفت بود، بہ سبیلِ ڈاک ارسال داشتہ، اغلب کہ بہ نظرِ انور گزشتہ باشد۔ دریں زمانہ یک از دوستاں کتابے معہ نقشہ ہائے آثارِ عماراتِ دہلی کہنہ و نو نگاشتہ، گوئی چمنے آراستہ است و معہذا بابِ چہارم کہ ختمِ کتاب بر آنست، رقم ہائے اشعارِ سخن سنجانِ ایں دیار ہم دارد۔ چوں بندہ را ایں نسخہ از روئے جامعیت پسند آمد، یک نسخہ از نسخِ منطبعہ کہ مشتمل بر سہ جلد است، از مطبع خریدہ بہ ارمغاں می فرستم و چشمِ قبولِ ایں نذرِ محقر دارم و اطلاعِ رسیدنِ ایں رامع الجوابِ نامہ پیشیں امیدوارم۔ والسلام اسد اللہ۔
فقط یکشنبہ ۲۷ ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۳ مطابق ۵ ردسمبر سنہ ۱۸۴۷ عیسوی

ہم از روئے احتیاط و ہم از راہِ یکرنگی بیرنگ فرستادہ ام و ادائے محصولِ ڈاک را بر ملازماں حوالہ کردہ ام۔ فقط فقط''

مہر اسد اللہ الغالب

اس خط کی پہلی اہمیت تو یہ ہے کہ یہ مولوی رجب علی خاں ارسطو جاہ کے نام غالبؔ کا

سب سے قدیم دریافت شدہ خط ہے، مزید برآں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے درمیان اس سے قبل بھی خط و کتابت کی راہ کشادہ تھی۔

دوسری اہمیت یہ ہے کہ اس سے سرسید کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کے بارے میں غالب کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ ان کی مرتب کی ہوئی مشہور تاریخی کتاب ''آئینِ اکبری'' کو تقویم پارینہ اور مردہ پروری کی کوشش قرار دے کر اس کی افادیت سے انکار کر چکے تھے۔

جنوں بریلوی سے منسوب غالب کے دو فارسی خط

مجلہ نقوش لاہور کے 'خطوط نمبر' کی جلدِ اوّل (شمارہ نمبر ۱۰۹، بابت اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) کے صفحہ نمبر ا سے صفحہ نمبر ۲۰ تک اولاً بہ صورتِ عکس بعد ازاں صفحہ نمبر ۶۵ سے صفحہ نمبر ۷۵ تک صاف نستعلیق خط میں اٹھارہ نادر خطوط شائع ہوئے ہیں، جن میں سے چودہ اردو میں ہیں اور چار فارسی میں۔ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی نے "۱۸ خطوط، ۱۶ غالؔب کے اور دو غالب کے نام" کے عنوان سے صفحہ نمبر ۲۹ سے صفحہ نمبر ۳۲ تک اپنے تعارفی نوٹ میں ان خطوں کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کے مطابق ان میں سے چودہ خط غالب کی طرف سے قاضی عبدالجمیل جنوںؔ بریلوی کے نام، دو خط غالؔب ہی کی طرف سے مولوی نجف علی (اصلاً حکیم غلام نجف) کے نام اور دو مولوی نجف علی (اصلاً حکیم غلام نجف) کی طرف سے غالب کے نام ہیں۔ جنوںؔ کے نام کے چودہ خطوط میں سے گیارہ اردو میں ہیں اور تین فارسی میں۔ ان میں سے فارسی کے دو اور اردو کا ایک خط غیر مطبوعہ ہے۔ یہ تینوں خط پہلی بار 'نقوش' کے اس شمارے کے توسط سے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ عابدی صاحب اپنی شہرت کے اعتبار سے برِ صغیر ہند و پاک کے ممتاز ترین فارسی دانوں، محققوں اور غالب شناسوں میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے فارسی کے جن دو غیر

مطبوعہ خطوط کو جنوںؔ سے منسوب کیا ہے، ان کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جو فارسی زبان سے بہ قدرِ ضرورت واقفیت کے ساتھ ساتھ غالبیات کے مختلف پہلوؤں پر بھی تھوڑی بہت نظر رکھتا ہے، بہ آسانی اس کا درک کر سکتا ہے۔ ان دونوں خطوط میں سے پہلے اور بہ اعتبارِ سلسلہ آٹھویں خط کا اصل متن حسبِ ذیل ہے:

''یزدانِ آرزو بخشِ آرزو مند بخشائے راسپاس کہ شفیقِ مکرم مولوی اشفاق حسین اگرچہ وقتِ رفتن بیگانہ وار رفتند و رسمِ وداع فرو گزاشتند، اما ازاں پس کہ بہ منزل آرمیدند، نامہ فرستادند وآں زخمِ جاں گزار ابدیں حسن ادا مرہم نہادند و سپاسِ دیگر آں کہ سررشتۂ کارے کہ داشتند، از کف نرفت و بافرماں دہ سازگاری روے داد۔ بارے خوش ست اگر ہم بدیں روش گاہ گاہ بہ نامہ یاد آورند و دراں کوشند کہ مہر ہا روز افزوں و دوستی ہا دیریں گردد۔ از من و رویدادِ رنجوری من پرسیدہ اند، فارغ باشند کہ از رنج آزاد واز دوا فارغم، رنجوری رفتہ و ناتوانی باقیست۔ چوں ہر چہ ہست می گزرد، دانم کہ ایں نیز نپاید۔ والا جاہ نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر و رفیع جایگاہ غیاث الدولہ رضی الدین حسن خاں بہادر و اقبال نشاں میرزا زین العابدین خاں بہادر سلام می رسانند و در گزارشِ سپاسِ یاد آوری با منِ بے نوا ہم زبانند۔ والسلام از اسد اللہ بخشتہ سہ شنبہ پنجم ماہِ روزہ و نہم ستمبر۔''

سہ شنبہ کی قید کے ساتھ اس خط کی مکمل تاریخ ۵؍رمضان المبارک ۱۲۶۱ھ مطابق ۹؍ستمبر ۱۸۴۵ء قرار پاتی ہے۔ جنوںؔ کے نام غالب کا قدیم ترین خط جو 'پنج آہنگ' اور 'نقوش' کے متذکرۂ صدر خاص نمبر، دونوں میں شامل ہے، منقولۂ بالا خط کو ان سے منسوب کرنے میں مانع ہے۔ 'پنج آہنگ' میں اس خط کے آخر میں تاریخِ تحریر ''شنبہ، بست وہشتمِ صفر سنہ ۱۲۶۹ ہجری'' درج ہے لیکن 'نقوش' میں شامل اصل خط کے عکس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح تاریخ ''شنبہ، بست وہشتمِ صفر سنہ ۱۲۶۶ ہجری'' ہے جو ۱۲؍جنوری ۱۸۵۰ء کے مطابق ہے۔ یہ خط جنوںؔ کے جس خط کے جواب میں لکھا گیا ہے، اس کے ساتھ انھوں نے اپنی چند غزلیں بھیج کر ''خواہشِ حک و اصلاح''

کا اظہار کیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ان کے اور غالب کے درمیان مکاتبت کے سلسلے کا اولین خط قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے تقریباً چار برس، چار مہینے قبل ۹ ستمبر ۱۸۴۵ء کو لکھا ہوا زیرِ بحث خط ان کے نام نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مالک رام صاحب کے مطابق جنوں ۱۲۵۱ھ مطابق ۳۶-۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے تھے[1]۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو رمضان ۱۲۶۱ھ مطابق ستمبر ۱۸۴۵ء میں ان کی عمر دس سال کے قریب ہوگی۔ عمر کے اس حساب سے بھی اس زمانے میں غالب کی ان سے مراسلت بعید از قیاس ہے۔

وزیر الحسن عابدی مرحوم کے مطابق زیرِ بحث خط ''نامکمل'' ہے، لیکن انھوں نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ ''نامکمل'' سے ان کی کیا مراد ہے؟ ظاہری صورتِ حال یہ ہے کہ خط کے پیش کردہ متن کا ''یزدانِ آرزو بخش'' سے ''بہ منزل آرمیدند'' تک کا ابتدائی حصہ اور ''سپاسِ یادآوری'' سے ''والسلام'' تک کا آخری حصہ جو ''رضی الدین حسین خاں بہادر'' سے ''نہم ستمبر'' تک باقی متن کی بائیں جانب عمودی طور پر لکھی ہوئی عبارت کا جزوِ آخر ہے، رسالے میں شامل اس کے عکس سے غائب ہے۔ اگر ''نامکمل'' سے عکس کے اس نقص کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے تو اس کی کتابت شدہ نقل کی پیشانی پر ''نامکمل خطِ غالب'' کے اندراج سے اس کی وضاحت بالکل نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف اگر فاضل مرتب یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کے مشاہدے کے مطابق موجود متن کے آغاز سے قبل روایتی انداز میں مکتوب الیہ سے خطاب پر مشتمل کم از کم ایک سطر لازماً ضائع ہو چکی ہے تو اسے صاف طور پر بیان کر دینا چاہیے تھا۔ بہ صورتِ دیگر خط کو پورے وثوق کے ساتھ ''نامکمل'' نہیں کہا جا سکتا کیونکہ غالب کے فارسی و اردو خطوط میں متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں انھوں نے عام آدابِ نامہ نگاری کے برخلاف کسی تمہید کے بغیر اصل مطلب سے خط کا آغاز کر دیا ہے۔

خط میں مولوی اشفاق حسین کے نام کے علاوہ کوئی ایسا کلیدی اشارہ موجود نہیں جس کے حوالے سے اس کے مکتوب الیہ کے تعین کا مسئلہ حل کیا جا سکے۔ غالب کے ارد گرد ان کے ایک شاگرد حکیم محمد اشفاق حسین زکی مارہروی کے علاوہ اس نام کا کوئی اور شخص نہیں پایا جاتا، لیکن مالک رام صاحب کے مطابق وہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے تھے[2]۔ یعنی بہ اعتبارِ عمر جنوں سے بھی ڈیڑھ دو سال چھوٹے تھے، اس لیے نام کا یہ حوالہ ان کی طرف بھی راجع نہیں ہو سکتا۔ چونکہ یہ خط جنوں اور

غالبؔ کی ایک دوسرے کے نام کی تحریروں کے ساتھ ''نقوش'' تک پہنچا ہے اور جنوںؔ بریلی کے متوطن تھے، اس لیے یہ امر خارج از امکان نہیں کہ مولوی اشفاق حسین بریلی سے تعلق رکھتے ہوں۔ واقعہ بہ ظاہر کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ حکیم مولوی سید اشفاق حسین بریلی کی ایک معروف شخصیت تھے۔ انھوں نے دہلی میں رہ کر غالبؔ کے دوست، مربی اور معالج حکیم احسن اللہ خاں سے فنِ طب کی تحصیل کی تھی۔ ان کے والد مولوی سید بشیر الدین ہاشمی بریلی اور اس کے قرب و جوار میں بہ حیثیت منصف سرکاری خدمات پر مامور رہے تھے۔ جنوںؔ بھی اس وقت کے صوبۂ شمال مغربی کے محکمۂ جوڈیشل سروس سے وابستہ تھے۔ غالبؔ نے اپنے ایک خط میں جس کی تاریخ نامعلوم ہے، انھیں اس محکمے میں حصولِ ملازمت پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ عہدہ آپ کو مبارک ہو اور مجھ کو اسی طرح صدر الصدوری کے منصب کی مبارک باد لکھنی نصیب ہو[3]۔''

۲۸/ اگست ۱۸۵۹ء کے خط کے لفافے پر درج پتے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوںؔ اس زمانے میں بیسل پور میں منصفی کے عہدے پر فائز تھے[4]۔ بیسل پور اس وقت بریلی سے متصل ضلع پیلی بھیت کی ایک تحصیل ہے۔

مولوی مہیش پرشاد کو بریلی میں جنوںؔ کے صاحبزادے قاضی محمد خلیل حیرانؔ سے غالبؔ کے خطوط اور ان کی اصلاح کردہ غزلوں کا جو ذخیرہ دستیاب ہوا تھا، اس میں مولوی عزیز الدین عزیزؔ وصادق بدایونی کے نام غالبؔ کے واحد اردو خط کی ایک نقل بھی شامل تھی[5]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوںؔ کو اپنے استاد کی تحریریں جمع کرنے اور انھیں محفوظ رکھنے سے خاص دلچسپی تھی۔ ممکن ہے کہ غالبؔ کا یہ فارسی خط مولوی اشفاق حسین یا ان کے والد مولوی بشیر الدین کے نام ہو اور باہمی تعلقات کی بنا پر جنوںؔ نے ان سے حاصل کر لیا ہو۔ لیکن یہ محض قیاس ہے اور قیاس ہمیشہ شک کے دائرے میں رہتا ہے۔

مولوی بشیر الدین کے بارے میں ہماری معلومات صرف اس حد تک محدود ہے کہ وہ سہسوان (ضلع بدایوں) کے متوطن تھے اور ان کے والد کا نام سید محمد ارزانی تھا۔ ان کا انتقال کب ہوا، یہ بھی کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کے چار بیٹے تھے، جن میں سے تیسرے فرزند مولوی حکیم سید اشفاق حسین علم و عمل دونوں کے اعتبار سے اپنے بھائیوں میں سب پر فائق تھے۔

ان کی ولادت ۱۲۴۰ھ (۲۵-۱۸۲۴ء) کے قریب سہسوان میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل وہیں طے کیے۔ بعد ازاں بدایوں میں مولانا فضلِ رسول اور بریلی میں مولوی رحیم اللہ کے حلقۂ درس میں شامل رہ کر علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی۔ آخر میں علمِ طب کے حصول کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ وہاں سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک وطن میں مطب کرتے رہے۔ اسی دوران ڈپٹی کلکٹری کے لیے ان کا انتخاب ہو گیا۔ اس سلسلے سے ممالکِ متوسط کے کئی شہروں میں مامور رہے۔ پنشن لینے کے بعد بریلی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اولاد کی تعلیم کی غرض سے متعلقین کے بریلی میں قیام کا انتظام اس سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ جون ۱۹۰۱ء میں بریلی ہی میں ان کی وفات ہوئی ہے۔[6]

اب دوسرے اور بہ لحاظِ ترتیب نویں خط کا متن ملاحظہ ہو:

"قبلۂ جان و دلِ غالب خستہ جانِ خونیں دل! سلامت

دی روز شام گاہ از بزمِ انس بہ غم کدۂ خویش رسیدم و شب آرمیدہ دروں خفتم۔ نہ وجعے و نہ المے، نہ حرارتے و نہ التہابے۔ بامداداں تا از خواب برجستم، کام و زبان و دہن را تلخ یافتم و چشم و بناگوش و تارکِ سر را وقفِ درد۔ عرقِ شیر با شربتِ نیلوفر آشامیدم و بعد از دو ساعت شیرۂ کاسنی و مغزِ تخمِ کدو نیز با شربتِ نیلوفر نوشیدم و گرداگردِ چشم و بناگوش را بداں ضماد اندودم۔ بالجملہ ایں وقت باز شیرۂ کاہو و تخمِ خیارین با شربتِ خانہ ساز نوشیدم۔ التہابِ باطن ہمانست کہ بود و دردِ چشم و بناگوش قدرے کمتر از انست کہ بود۔ چوں قربِ مکانی حاصل است و نالۂ مظلوم تا داور می توانست رسید، بہ چشمداشت اطلاع گزاردہ آمد۔ زیادہ نیاز است و بس۔ از اسد اللہ رنجور

اس خط سے تین اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ مکتوب نگار نے ایک دن پہلے شام کے وقت مکتوب الیہ سے ان کے گھر پر ملاقات کی تھی۔

(۲) دوسری یہ کہ مکتوب الیہ بہ اعتبارِ پیشہ طبیب تھے اور مکتوب نگار اس وقت ان کے زیرِ علاج تھے۔

(۳) تیسری یہ کہ مکتوب الیہ کا مکان مکتوب نگار کے مکان سے اس قدر قریب تھا کہ اول الذکر ان کے کراہنے کی آواز بہ آسانی سن سکتے تھے۔

ظاہر ہے کہ غالبؔ نہ تو جنوںؔ بریلوی سے جو دہلی سے ڈھائی سو کلومیٹر دور بریلی میں مقیم تھے، شام کے وقت ان کے گھر پر جا کر ملاقات کر سکتے تھے۔ نہ وہ طبیب تھے کہ بہ غرضِ علاج ان سے رجوع کی ضرورت پیش آتی اور نہ یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے گھر بیٹھے غالبؔ کے کراہنے کی آواز سن لیتے، اس لیے وہ کسی بھی صورت میں اس خط کے مکتوب الیہ نہیں ہو سکتے۔ اس صراحت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس خط کا مکتوب الیہ کون ہے؟ اس کا جواب کہیں اور نہیں، خود غالبؔ ہی کی تحریروں میں موجود ہے۔

منشی جواہر سنگھ جوہرؔ کے نام ۱۳ / مارچ ۱۸۴۵ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ان کے معالج حکیم امام الدین خاں تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''بہ فرمانِ حکیم امام الدین خاں رگِ باسلیق زدہ ام و آبِ شاہترہ سبز مروّق می آشامم ''

آٹھ سال بعد منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام ۹ / مارچ ۱۸۵۳ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

''حکیم امام الدین خاں سے اب رجوع نہیں کرتا۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب میرے چارہ گر ہیں۔''

اس سے اگلے ہفتے میں حقیرؔ ہی کے نام مکتوب مورخہ ۱۷ / مارچ ۱۸۵۳ء میں مزید وضاحت فرماتے ہیں:

''امام الدین خاں سے میرا اعتقاد، ان کی مجھ پر عنایت بہ دستور، لیکن حکیم احسن اللہ خاں صاحب سے ربط بڑھ گیا اور اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے اور یہ بھی پایۂ علم و عمل میں کسی سے کم نہیں ہیں۔''

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ غالب ابتدا میں بہ غرضِ علاج حکیم امام الدین خاں سے رجوع کرتے تھے۔ بعد ازاں جب حکیم احسن اللہ خاں سے ربط ضبط بڑھا تو وہ ان کے معالج قرار پائے۔ اس لیے زیرِ بحث خط انھی دونوں طبیبوں میں سے کسی ایک کے نام ہو سکتا ہے۔ اس فیصلہ کن مرحلے پر غالب کا یہ بیان کہ انھیں مکتوب الیہ سے قربِ مکانی حاصل تھا، کلیدی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کا مکان محلّہ حوض قاضی میں سرکی والوں کے بازار میں تھا۔ اس کے علاوہ ان کی ایک حویلی شہر سے باہر مہرولی میں بھی تھی، جبکہ حکیم امام الدین خاں محلّہ بلّی ماران میں رہتے تھے۔ جہاں غالب نے اپنی زندگی کے آخری سولہ سترہ سال گزارے۔ اس طرح یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ اس کے مخاطب حکیم امام الدین خاں ہیں، حکیم احسن اللہ خاں نہیں۔ حکیم امام الدین خاں حکیم شریف خاں کے بیٹے تھے جن کی نسبت سے اطبائے دہلی کا یہ مشہور خاندان ''خاندانِ شریفی'' کہلاتا ہے۔ بلّی ماران میں اس خاندان کی حویلیوں اور مکانات کا ایک طویل سلسلہ تھا جس کے کچھ نشانات اب بھی باقی ہیں۔ غالب نے آخرِ عمر میں جو حویلی کرائے پر لی تھی، وہ اسی خاندان کے ایک فرد حکیم محمد حسن خاں کی ملکیت تھی۔ چنانچہ مرزا ہرگوپال تفتہ کو ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے۔''

علاء الدین خاں علائی کے نام کے ایک خط مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۲ء میں بھی انھوں نے حکیم محمود خاں کو جو حکیم امام الدین خاں کے حقیقی بھتیجے تھے، اپنا ''ہمسایۂ دیوار بہ دیوار'' لکھا ہے۔ اس طرح ''قربِ مکانی'' کی کیفیت بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ان بنیادی مسائل کے تصفیے کے بعد آخر میں یہ طے کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ یہ خط کس زمانے میں لکھا گیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ مرزا صاحب نے حکیم امام الدین خاں کے پڑوس میں قیام کس زمانے میں اختیار کیا اور حکیم احسن اللہ خاں سے رجوع کی ابتدا کب ہوئی؟ ۹ر مارچ ۱۸۵۳ء کا ان کا یہ بیان ہمارے سامنے آچکا ہے کہ ''اب میں حکیم امام الدین خاں سے رجوع نہیں کرتا، حکیم احسن اللہ خاں میرے چارہ گر ہیں۔'' اس اعتبار سے اس خط کا مارچ

۱۸۵۳ء سے پہلے لکھا جانا ایک طے شدہ امر ہے۔ غالب اس سے کم و بیش ایک سال قبل ۱۸۵۲ء کے اوائل میں گلی قاسم جان میں واقع میاں کالے کی حویلی سے حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں منتقل ہوئے تھے۔ چنانچہ ۲۲/ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ بلّی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔"

اس کے صرف دو دن بعد تفتہ ہی کو فارسی میں لکھے ہوئے ایک خط میں مزید وضاحت کے ساتھ رقم طراز ہیں:

'بعدِ رحلت کالے صاحب در و دیوارِ آں کاشانہ با من نساخت۔ در کوچۂ بلّی ماراں نشیمنے برگزیدہ ام، امید کہ نعشِ مرا ہم از درِ ایں کلبہ بیروں آورند[۸]۔"

کالے صاحب کا انتقال ۱۵/ صفر ۱۲۶۸ھ مطابق ۹ دسمبر ۱۸۵۱ء کو ہوا تھا[۹]۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرزا صاحب نے ۹/ دسمبر ۱۸۵۱ء اور ۲۲/ مارچ ۱۸۵۲ء کے درمیان کسی وقت حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں سکونت اختیار کی ہوگی۔ اس طرح یہ خط ۹/ دسمبر ۱۸۵۱ء کے بعد اور ۹/ مارچ ۱۸۵۳ء سے قبل کسی وقت لکھا گیا ہوگا۔ سرسری طور پر اسے ۱۸۵۲ء کی تحریر قرار دیا جا سکتا ہے۔

'نقوش' کے متذکرۂ صدر خطوط نمبر میں جناب کسریٰ منہاس نے "جنوں و غالب" کے زیرِ عنوان جنوں کی ایسی پچیس غزلیں پیش کی ہیں جن کے بعض اشعار پر غالب کی اصلاحات درج ہیں۔ ان میں بیس غزلیں اردو کی ہیں اور پانچ فارسی کی۔ مضمون نگار موصوف کے مطابق یہ غزلیں ایک مجموعے کی صورت میں نیشنل میوزیم، کراچی میں محفوظ ہیں۔ غالب اور جنوں نیز غالب اور مولوی نجف علی (اصلاً حکیم غلام نجف) کے درمیان مراسلت کے سلسلے کی متذکرۂ بالا اٹھارہ تحریروں میں سے بھی دو پر نیشنل میوزیم کے اندراج نمبر N.M. 1956. 10 اور N.M. 1965.11 موجود ہیں۔ اس بنا پر قیاس یہ ہے کہ یہ تمام تحریریں میوزیم کو کسی ایک ہی شخص سے حاصل ہوئی ہوں گی۔ ان میں سے دو رقعات کا غالب بہ نام مولوی نجف علی (اصلاً حکیم غلام نجف خاں) اور دو کا مولوی نجف علی (اصلاً حکیم غلام نجف خاں) بہ نام غالب ہونا میوزیم کے

کار پردازوں پر ظاہر ہو گیا، اس لیے انھیں چھوڑ کر باقی تمام تحریروں کو کسی غور و فکر کے بغیر غالبؔ بہ نام جنوںؔ کے طور پر درج فہرست کر دیا گیا۔ محترم وزیر الحسن عابدی نے بھی انھی فہرست سازوں کا اتباع فرمایا اور اس طرح یہ دونوں خط جنوںؔ بریلوی کے نام کے مکتوبات میں شامل ہو گئے۔

حواشی:

۱۔ تلامذۂ غالب از مالک رام، طبعِ دوم، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۳۵

۲۔ ایضاً، تلامذۂ غالب، ص ۲۲۷

۳۔ غالب کے خطوط، جلدِ چہارم، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۹۹

۴۔ ایضاً، غالب کے خطوط، جلد چہارم، ص ۱۴۹۶

۵۔ خطوط غالب، مرتبہ مولوی مہیش پرشاد، ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ۱۹۴۱ء، ص ط ی

۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: حیات العلما از مولوی عبدالباقی سہوانی، مرتبہ حنیف نقوی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۰، ص ۵۰

۷۔ باغِ دودر، مرتبہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۴

۸۔ ایضاً، باغِ دودر، ص ۱۶۱

۹۔ تذکرۂ ماہ و سال از مالک رام، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۸۹

(۸/ستمبر ۲۰۱۱ء)

پروفیسر حنیف نقوی کا عکس تحریر

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں